سرگزشتِ مجاہد
ازی عبدالکریم چمرکنڈی
ذخیرہ کتب:۔ محمد احمد ترازی

سرگذشتِ مجاھد

(عبدالکریم چمرکنڈی)

مرتّبہ

محمد حامد

ادارہ مطبوعاتِ سلیمانی
۴۰ بی۔ اردو بازار لاھور

ناشر : ــــــــــ عبدالوحید سلیمانی

مطبع : ــــــــــ شرکت پرنٹنگ پریس

طبع اول : ــــــــــ فروری ۱۹۸۱ء

تعداد : ــــــــــ ۱۰۰۰

قیمت : ــــــــــ ۱۸ روپے

کاتب : ــــــــــ محمد داؤد خوش نویس حضرت کیلیانوالہ

ان تمام گمنام مجاھدوں کے نام

جو

ایک صدی تک جماعتِ مجاھدین کے پرچم تلے
فرنگی استبداد کا مقابلہ کرتے رہے

فہرست ابواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

تمام تعریفیں اور حمد اللہ تعالےٰ کے لیے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالےٰ کی ہزار ہزار رحمتیں ہوں جن کی ہجرت و جہاد کی سنت نے ہر دور میں مسلمانوں کے لیے اسوۂ حسنہ کا کام دیا۔ سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کی جماعت نے برصغیر میں یہ فریضہ ادا کیا۔ عبدالکریم چمرکنڈی صاحب کی سرگذشت جوان کی آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی بلکہ داستان ہجرت و جہاد ہے وہ اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے جسے جماعت مجاہدین کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اس سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا غلامی کا عہد تیرہ و تار سہی لیکن اس میں بھی بے شمار مجاہدین تھے جو لہو کے چراغ جلاتے رہے تاآنکہ ہمیں آزادی کی صبح نصیب ہوئی۔ امرتسر کے رہنے والے اور چمرکنڈ میں جہاد کے ساتھ اس درجہ کی وابستگی رکھنے والے کہ اپنا نام ہی چمرکنڈی رکھا، جب نوجوانی میں ہجرت کی راہ پر گامزن ہوئے تو بستر مرگ پر پڑی بیوی کو بھی ساتھ لے لیا کہ یہ جہاں فوت ہو گی وہاں اسے دفن کر کے اپنی راہ لیں گے۔ دوسری طرف بیوی کی وفا شعاری اور ایثار دیکھیے کہ انھوں نے بھی مرتے دم تک ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ بحمد اللہ تعالےٰ نے کابل پہنچنے سے پہلے ہی شفا دی اور آج عبدالکریم چمرکنڈی صاحب اور ان کی اہلیہ پوتوں پڑپوتوں کو پھولتے پھلتے دیکھ رہے ہیں۔

مجھے ۱۹۷۲ء میں مولانا صبغت اللہ صاحب (امیر نعمت اللہ شہید کے بیٹے) نے یہ بتایا کہ جماعت مجاہدین کے ایک اہم رکن عبدالکریم چمرکنڈی صاحب نے سوانح لکھی ہے جس میں جماعت کے حالات تفصیل سے درج ہیں۔ ۱۸۵۸ء سے سید احمد شہیدؒ اور جماعت مجاہدین

کے بارے میں مطالعہ و تحقیق کے کام میں مصروف تھا۔ میرے لیے یہ خبر بہت اہم تھی کہ ایک غیر
مطبوعہ تحریر موجود ہے۔ چنانچہ میں نے چمرکنڈی صاحب کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا کہ
میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ چمرکنڈی صاحب نے اپنی پیرانہ سالی اور بیماری کے باوجود یہاں
سے چند ہی آکر سرگزشت کو مولینا سعد الدین صاحب کے حوالے کیا اور بتایا کہ یہ مجھے پہنچا
دی جائے۔ مجھے اطلاع ملی تو میں مولینا سعد الدین صاحب سے یہ لے آیا اور چند ہی
روز میں پڑھ لی۔

۲۰۰۳ء کے موسم سرما کی ایک انتہائی خنک سہ پہر کو دسطانہ کلاس سے باہر نکلا تو مولانا
سعد الدین صاحب ایک سال خوردہ بزرگ کو ساتھ لیے میرے پاس پہنچے۔ گذشتہ دو تین
روز سے بارش کا سلسلہ جاری تھا۔ مولینا سعد الدین صاحب نے تعارف کرواتے ہوئے
بتایا کہ یہ بزرگ عبدالکریم چمرکنڈی صاحب ہیں اور آج ہی صبح گوجرانوالہ سے یہاں پہنچے ہیں
ان کے عزم و ہمت کے بارے میں جو کچھ سرگزشت میں پڑھا تھا وہ یقیناً سچ تھا۔ میرے
یہاں تین روز قیام فرمایا۔ یہ دن میرے لیے انتہائی راحت افزا تھے کہ تحریک مجاہدین کے
ایک انتہائی اہم فرد نے میرے غریب خانے کو نوازا تھا۔

اس کے بعد میرا دو تین بار ملتان جانا ہوا اور میں ان کی صحبت سے مستفید ہوتا رہا
پنڈی میں ان کے قیام کے دوران میں نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ریڈیو پاکستان
کے جنرل پروڈکشن یونٹ سے کہا کہ وہ چمرکنڈی صاحب کی سرگزشت کو ریکارڈ کر لیں۔
چنانچہ نقشبندی صاحب نے ان کی روداد حیات کا ایک حصہ محفوظ کیا۔ اسی طرح ڈاکٹر
خورشید کمال عزیز صاحب چیرمین نیشنل ہسٹاریکل کمیشن اور میں نے مل کر ان کا انٹرویو لیا جو
کمیشن نے ٹیپ ریکارڈ کے ذریعے محفوظ کر لیا۔

عبدالکریم چمرکنڈی صاحب کا حافظہ اس عمر میں بھی اس قدر قوی ہے کہ انسان کو تعجب
ہوتا ہے۔ سوانح میں ایک جگہ سولہ افراد کا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا تذکرہ تھا۔
یہ واقعہ ۵۵ برس پہلے کا تھا۔ جب میں نے پوچھا تو آپ نے چودہ نام تو اسی وقت گنوا دیے
دو کے بارے میں کہنے لگے کہ میں بھول رہا ہوں اور دوسرے دن وہ بھی بتا دیے۔ حساب

میں مہارت کا یہ حال ہے کہ چھ اعداد کی رقم کو چھ اعداد کی رقم سے زبانی ضرب دے کر آپ کو جواب بتا دیں گے۔ اسی طرح تقسیم کے بارے میں محیر العقول جواب دیں گے۔ کہہ رہے تھے کہ یہ میری تفریح ہے کہ کوئی بھی رقم یا نمبر ہو تو اسے ممکنہ طریقوں سے تقسیم کرنے کا سوچتا رہتا ہوں۔

مولانا بشیر صاحب شہید جن کا خاصا تذکرہ اس سرگذشت میں موجود ہے اور جو یقیناً بیسویں صدی کے آغاز میں برصغیر کی انتہائی اہم مسلم شخصیت گذرے ہیں، چمرکنڈی صاحب سے کہا کرتے تھے کہ اگر ان کے پاس چھ افراد ہوں تو وہ ہندوستان سے انگریزوں کو باہر نکال دیں۔ ان میں مولانا عبدالقادر قصوری اور علامہ اقبال کا نام لیا کرتے تھے۔ چمرکنڈی صاحب کو وہ اپنا نصف آدمی قرار دیتے تھے۔ اسی سے ان کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

چمرکنڈ اور کابل میں ان کی کارروائیوں کا تذکرہ اس میں آچکا ہے۔ آپ کا دوبارہ امرتسر میں آنا بھی ذاتی کاموں کے لیے نہ تھا بلکہ یہ بھی جماعت کی خدمت اور دیگر تنظیمی کاموں کے لیے تھا۔ شاہی قلعہ میں آپ کی تفتیش کے واقعات سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزوں کی خفیہ پولیس کس طرح ان کی نگرانی کیا کرتی تھی۔ پھر اس تمام آزمائش کے دور میں آپ کی ثابت قدمی اور اللہ تعالے سے گہرا تعلق ایسی چیزیں ہیں جو آج کل کے دور میں عنقا ہو رہی ہیں۔

چمرکنڈی صاحب کی سوانح جو درحقیقت جماعت مجاہدین کی ایک ربع صدی کی داستان کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، تاریخ کے نقطہ نظر سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ انہوں نے تاریخ کو بنتے بگڑتے دیکھا ہے۔ اور بہت قریب سے دیکھا ہے انہوں نے افغانستان کی حریت اور آزادی اور برصغیر کو انگریزوں سے نجات دلوانے کی عظیم تحریک میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے باوجود کہ انہوں نے اہم کارنامے انجام دیے انہوں نے اپنے آپ کو اخبارات اور ابلاغ عامہ کے ذرائع کی زینت نہیں بنایا۔ وہ اور ان کے ساتھی اللہ تعالے کی رضاجوئی کو اپنا مقصد قرار دیتے ہوئے اس کی راہ میں جدوجہد کرتے رہے۔ ان کی زندگی کا یہ پہلو بے حد اہم ہے۔ ہمارے اس دور میں جو کہ شہرت و عزت طلبی کا دور ہے ایسی مثالیں نایید ہیں۔ جماعت مجاہدین نے برصغیر کی

تاریخ میں جو اہم کردار ادا کیا وہ انگریزوں نے بوجوہ منظرِ عام پر آنے نہیں دیا۔ ان کے بعد بھی جو تاریخ لکھی گئی اس میں دفود اور مطالبات کا ذکر تو ہے لیکن اس لہو کا کوئی تذکرہ نہیں جو جماعت مجاہدین ایک صدی تک برصغیر کی سرحد پر بہاتی رہی۔ شہداء کا خون مورخوں کی بے التفاتی سے شاکی نہیں کیونکہ انہوں نے صرف اور صرف اللہ کی رضا جوئی کے لیے یہ سب کچھ کیا لیکن ملت پر ان کا جو احسان ہے کیا اس کا شکریہ ادا کرنا ہم پر لازم نہیں۔ یہ سوانح تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک انتہائی اہم ماخذ کی حیثیت رکھے گی۔ میں اسے اپنی سعادت سمجھتا ہوں کہ اسے مرتب کرنے اور قارئین کے سامنے موجودہ شکل میں پیش کرنے کا موقع حاصل کر سکا۔ جمر کنڈی صاحب کا مجھ پر یہ احسان ہے کہ انہوں نے مجھے اجازت دی کہ اسے مرتب کر دوں۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ دیر تک ہمارے سروں پر قائم رکھے۔ اور میری اس حقیر کوشش کو زادِ آخرت بنائے آمین۔

محمد حامد ۱۵ جمادی الاول ۱۳۹۹ھ

الف ۷۲۲

سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی

پسِ تحریر

کتاب پریس میں جانے کے مراحل میں تھی کہ جمر کنڈی صاحب ہمیں چھوڑ کر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

۱۳ جون ۱۹۸۰ء ملتان کی شدید گرمی کو الوداع کہہ کر وہ جنت الفردوس کی ٹھنڈی چھاؤں میں آرام کرنے کے لئے چلے گئے۔ ع یعنی رات بہت جاگے تھے صبح ہوئی آرام کیا۔

انہوں نے اپنے شوہر کا ہر لمحہ ہجرت و جہاد میں گزارا۔ جانے سے چند روز پہلے تک وہ مصر تھے کہ وہ افغانستان میں ہونے والے جہاد میں حصہ لینے کے لئے جانا چاہتے ہیں۔ یہ بات انہوں نے اپنے ایک خط میں بھی لکھی جو قمر الدین صاحب کے نام لکھا تھا۔ ۸۷ سال کی عمر میں بھی جہاد کی خواہش میزبان رسول حضرت ایوب انصاری کی یاد دلاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے اور انکی آرزوؤں اور تمناؤں کو جلد بارآور ہوتا دکھائے۔ آمین!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ و نصلی علی رسولہ الکریم

معذرت

ایک دستکار مزدور سے کسی ادبی شاہکار کی تخلیق کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ادبی حیثیت سے یہ مجموعہ بے جوڑ الفاظ اور بے ربط جملوں کا ایک مرقع ہوگا۔ اس لیے ناظرین کی خدمت میں عرض گذار ہوں کہ میری اس کمزوری کو ملحوظ فرماتے ہوئے اس بار خاطر کو برداشت کریں جو اسقام و اغلاط سے پر تحریر کے مطالعہ کے وقت طبیعت پر ہو۔ میں لکھنا نہیں جانتا۔ باوجود اس کمی کے کیوں لکھ رہا ہوں۔ دراصل اس کی ضرورت یوں پڑی کہ میرے محترم بزرگ مولانا غلام رسول صاحب مہر نے غالباً ۶۲ء میں (جو جمعیت عالیہ مجاہدین ہندیہ یاغستان کی تاریخ مرتب کرنے کا عزم کر چلے ہوئے تھے) مجھے فرمایا کہ جمعیت مذکورہ کے وہ حالات جو میرے سامنے واقع ہوئے ہیں قلمبند کر کے ان کی خدمت میں پیش کروں۔ تاکہ وہ ان واقعات کو اپنے الفاظ میں درج کر سکیں۔ ایک قلیل الفرصت مزدور ہونے کی وجہ سے میں نے ۶۶ء کے آخری ماہ میں ایک مسودہ لکھ کر تیار کیا جس کی نظر ثانی کی ابھی فرصت نہیں ملی تھی کہ ۶۷ء کی ہجرت شروع ہو گئی۔ اور یہ کام ادھورا ہی پڑا رہا۔ اس کے بعد میں اب تک مولانا موصوف کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکا اب اخبارات میں یہ خبر دیکھی ہے کہ کتاب طباعت کے مرحلے طے کر رہی ہے۔ اور میری ادھوری کہانی اب دعوت از میری کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاہم اس خیال سے کہ شاید یہ کہانی کبھی ایسے ہاتھوں میں آجائے جو ان واقعات سے درس عبرت نکال کر منظر عام پر لا سکیں اور میری محنت رائیگاں نہ جائے۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

احقر العباد عبدالکریم جبر کنڈی

تمہید

جیسا کہ معذرت میں بیان ہو چکا ہے۔ کہ مولانا غلام رسول صاحب مہر کی مرتبہ تاریخ اب طباعت کے مرحلے طے کر رہی ہے۔ اب قصہ ہذا کو تفصیل سے بیان کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ تا کہ پڑھنے والوں کو اس تحریک کے بارے میں تفصیلی طور پر پتہ چل سکے۔ التجا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں حق اور باطل کو یہ کہنے کی اہلیت عطا کرے اور حق بات کا جرات مندانہ انداز سے ساتھ دینے کی توفیق دے۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ

اس قصہ میں مذکور اکثر شخصیتیں اس جہاں سے اٹھ چکی ہیں۔ سب کا معاملہ اللہ تعالےٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ سب پر رحم فرمائے اور ان کی لغزشیں معاف فرما دے اور اعمال حسنہ کی بہتر جزا بخشے (آمین)

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ؛ آمین

احقر العباد عبدالکریم میر کنڈی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

دیباچہ

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

قبل اس کے کہ میں اس حصتہ کا آغاز کروں۔ اس کے پس منظر پر ایک مجمل سی نظر ڈالی جائے تاکہ اس کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

حق و باطل کی آویزش دنیا کی پیدائش سے چلی آرہی ہے اور اہلِ ایمان (ایمان والے) اور اہل باطل (منکرین) دونوں گروہ ایک دوسرے کو پچھاڑنے میں مصروف رہتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی بے نیاز اور بے پرواہ ہے۔ نظامِ عالم کے قیام کے لیے چند اصول و ضابطے جو مالک کون و مکان نے مقرر فرما دیے ہیں۔ ان میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ لَا تَجِدُ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیلًا۔ ان ضوابط کی خلاف ورزی کرکے اہل ایمان فلاح نہیں پا سکے اور اگر اُن کی پابندی کریں گے تو فائدے سے محروم نہیں کیے جاتے یہ تاکیدہ کلیہ ہے جس میں استثناء نہیں۔ یہ دنیا جائے عمل ہے۔ جو بوئے گا سو کاٹے گا۔ اس میں کسی کی تمیز یا حمایت یا مخالفت نہیں کی جاتی ؎

ع گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

اللہ کریم نے جہاں حیاتِ انسانی کے بقا کے لیے زمین، آسمان، سورج، چاند

ستارے، بارش کا انتظام فرما دیا ہے۔ وہاں انسان کو ضابطۂ حیات سے بھی محروم نہیں رکھا گیا۔
چنانچہ انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرما کر ان کی اطاعت اور اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے پر امر فرمایا
جوں جوں انسانیت سِنّ بلوغ کو پہنچتی گئی۔ احکام بھی ترقی پذیر یا ارشاد ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین پر آئین حیات کی تکمیل فرما دی اور تمام انسان حضرت
خاتم المرسلین کی اتباع کے مکلف قرار دیے گئے اور آئندہ کے لیے انبیاء کی آمد کا سلسلہ
ختم کر دیا کیونکہ اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔

انبیاء علیہم السلام کی آمد پر انسانیت دو گروہوں مسلم و منکرین یا اہل حق و اہل باطل
میں بٹ گئی اور یہیں سے آویزش کا آغاز ہو گیا۔

کان الناس امة واحدة فبعث الله النبیین مبشرین ومنذرین وانزل معهم
الکتب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیه وما اختلف فیه الا الذین اوتوہ
من بعد ما جاءتهم البینت بغیا بینهم فهدی الله الذین امنوا لما اختلفوا فیه من الحق
باذنه والله یهدی من یشاء الی صراط مستقیم[1]

ترجمہ:۔ لوگ ایک ہی امت تھے۔ پس مبعوث فرمائے اللہ تعالےٰ نے انبیاء
علیہم السلام جو نیکیوں کو خوشخبری اور منکروں اور بدوں کو ڈراتے تھے اور اتاری
ساتھ انبیاء کے کتاب تاکہ وہ ان کے اختلافات کا فیصلہ حکم خداوندی کے
مطابق کریں اور نہیں اختلاف کیا تھا بیچ اس کے مگر وہ لوگ جو جان گئے جو ان کے
پاس کھلی نشانیاں آئی تھیں۔ آپس کی سرکشی کے باعث پس اللہ نے ہدایت دی مومنین
کو ساتھ حق کے اپنے اذن سے اور اللہ جیسے چاہیں ہدایت فرماتے ہیں۔

یہاں تک کہ اہل حق کو خبردار کر دیا گیا کہ تم اپنے پاؤں پر کھڑا رہنے کی کوشش کرو۔
منکرین کبھی بھی تمہاری بھلائی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔

ما یود الذین کفروا من اهل الکتاب ولا المشرکین ان ینزل علیکم
من خیر من ربکم والله یختص برحمته من یشاء والله ذو الفضل العظیم۔
ترجمہ[2] نہیں دوست رکھتے وہ لوگ جو منکر ہوں اہل کتاب میں سے یا مشرکین میں سے

اس بات کو اترے اوپر تمہارے بھلائی تمہارے رب کی طرف سے اور اللہ مختص کر دیتا ہے۔ رحمت اپنی سے جس کو چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل کا ہے

اللہ تعالیٰ کی یہ بھی سنت ہے کہ وہ کسی کو حق کی پیروی کرنے کے لیے مجبور نہیں کرتا۔ اور نہ کوئی انکار کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ کسی کے ساتھ ضابطہ الٰہی کی پابندی کے لیے سختی نہیں کی جاتی۔ البتہ ہدایت اور سرکشی کو الگ الگ ظاہر کر دیا گیا ہے۔ پس جو چاہے سرکشی سے باز رہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام جان لے اور ایک مضبوط رسی کو تھام لے جو ٹوٹنے والی نہیں۔ اللہ تعالیٰ سننے والے بھی ہیں اور جاننے والے بھی ہیں۔

اللہ تعالیٰ حق کو پسند فرماتے ہیں۔ حق اللہ تعالیٰ کا نور ہے۔ اور کافر (منکرین) چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو پھونکوں سے بجھا دیں۔ مگر اللہ تعالیٰ اپنے نور کو پورا کر کے رہیں گے۔ اگرچہ کافروں کو ناپسند ہو۔ اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ساتھ ہدایت اور دین حق کے تاکہ غالب کرے اس کو سب دینوں پر اور اگرچہ مشرک ناپسند کریں۔

اللہ تعالیٰ مومنین کو عمل کی شرط کے ساتھ غالب کرنے کا پکا وعدہ فرماتے ہیں۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتے ہیں ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے تم میں سے اور عمل کیے اچھے صالح یہ کہ البتہ ضرور، ضرور ان کو زمین میں حاکم بنائے گا۔ جیسا کہ حاکم بنایا ان سے پہلوں کو اور ضرور ضرور تمکنت بخشے گا ان کے لیے ان کے دین (ضابطے اور قانون) کو جس پر کہ وہ راضی ہوئے ہیں اور ان کے خوف کو امن میں بدل دیگا عجیب واقعہ ہے کہ جب مومنین کو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ وعدہ دیا گیا اس وقت مومنین کی جماعت نہایت قلیل اور کفار کے زور کے باعث خوف زدہ تھے۔ پھر یہ وعدہ حرف بحرف پورا اترا۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو نہ صرف غلبہ دیا بلکہ ان کی مرضی سے قانون الٰہی بھی نافذ کرنے میں کامیابی عطا کی اور خوف سے بھی ان کا چھٹکارا ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے اعمال صالح بجالانے والوں کو دنیا میں کامران فرمایا اور اُن سے راضی ہوا اور اپنے وعدے کے مطابق پورا پورا انعام دیا۔

اس کے بعد جوں جوں مخلصین مومنین کے بعد آنے والے ایمان اور عمل صالح میں کمزور ہوتے گئے اسی مقدار میں وہ خلافت علی الارض سے محروم ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ اسلام کا نام رہ گیا۔ قرآن پر عمل چھوڑ کر مسلمان نام کی ایک قوم کفار کی غلامی کی لعنت کا طوق گلے میں ڈالے ذلت اور ادبار کو اپنا کر اپنا وقت بسر کرنے لگی۔ اور غلامی ہی کو اپنا معیار زندگی قرار دے دیا۔

اس کے ساتھ ساتھ ہر دور میں اللہ کے مخلص بندے حق کی آواز بلند رکھنے کے نصب العین کو لے کر اٹھتے رہے۔ اور حق کو واضح اور روشن رکھنے کی کوششوں میں اپنی متاع حیات کو قربانی کے لیے پیش فرماتے رہے۔ اگرچہ وہ عہد اول کی شان واپس نہ لا سکے۔ کیونکہ کوئی قوم جب اجتماعی طور پر حق سے روگرداں ہو جائے یا وہ اجتماعی طور سے ایک نصب العین کو اپنا کر کوشاں نہ ہو بحیثیت کلی کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔ تاہم قلیل المقدار مخلصین حق کے نور کو روشن رکھنے میں کامیاب ہوتے رہے اور باطل اپنی مجموعی طاقتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے بھی حق کے نور کو بجھانے میں ناکام رہا۔ اور آئندہ بھی مخبر صادق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کے فرمان کے مطابق تا قیام قیامت یہ آویزش جاری رہے گی۔ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بو لہبی !!

مگر آخر کار حق کا بول بالا ہی رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے درجے بلند فرمائے جنہوں نے حق کی خاطر جان دی اور مبارک ہیں وہ لوگ جو حق کا ساتھ دیتے ہیں وہی لوگ آخر کامیاب ہوں گے جو حق کا ساتھ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور تمام مومنین کو حق کی حمایت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

عبدالکریم چمرکنڈی۔ جمعہ ۱۲ جمادی الاول ۱۳۷۳ھ
۷ جنوری ۱۹۵۴ء

باب اوّل

تحریکِ ہجرت

آغازِ داستان :-

• میری کہانی کا آغاز جولائی سنہ ۱۹۲۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ جب کہ اسی سال مئی میں حکومت برطانیہ کی مسلم کش پالیسی سے دل برداشتہ ہو کر مسلمانانِ ہند عموماً اور پنجاب اور صوبہ سندھ کے مسلمان خصوصاً افغانستان کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ ہجرت کا سبب سمجھنے کے لیے پہلی جنگِ عظیم جو سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۱۹ء تک جاری رہی تھی) کا مختصر حال جاننا ضروری ہے جس کے نتیجہ میں ہجرت کی تحریک جاری ہوئی تھی۔ اس جنگ عظیم میں ترکی جرمنی کا حلیف تھا اور برطانیہ جرمنی کے مخالف ایک فریق کی حیثیت سے شامل ہوا تھا۔ برطانیہ ترکی کو ختم کرنا چاہتا تھا مگر اس ارادے کی کامیابی کے لیے ہندوستان کی فوج کو استعمال کیے بغیر کامیابی ناممکن تھی اور ہندوستانی فوج میں سپاہ کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی جو تعداد اور فنِ حرب کے لحاظ سے ہندوستان کی ساری قوموں پر غالب تھی۔ برطانیہ نے مسلمانوں کو ترکی کے خلاف استعمال کرنے کے لیے جھوٹے وعدوں کا جال پھیلایا اور علماءِ سوء اور پیرانِ طریقت کی وساطت اور مرزائیوں، قوم فروش سرداروں اور خان بہادروں کی امداد سے یہ شور پھونکا کہ یہ جنگ مذہبی نہیں اور مقاماتِ مقدسہ کی تقدیس اور حرمت کو ملحوظ رکھ کر ان پر قبضہ نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ وہ خلیفۃ المسلمین تاجدارِ ترکی کے قبضے میں ہی رہنے دیے جائیں گے۔ مگر یہ ان کا فریب اور جنگی چال تھی اور برطانیہ نے اسی طرح کا جھکمہ عربوں کو دیا کہ تم خلافت سے بغاوت کر کے ہمارا ساتھ دو تو ہم مقاماتِ مقدسہ ترکی سے چھین کر تمہیں دے دیں گے۔ وہ بھی اس جھانسے کا شکار ہو گئے اور اب تک جب کہ پہلی جنگ عظیم

کو ختم ہوئے ۶۰ سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ قبضۂ فلسطین اور حکمداری کے جنگل کے عذاب میں اس غداری کی سزا بھگت رہے ہیں۔ مسلمانان ہند کو اس صورت حال کے مقابلے کے لیے ہجرت کی تحریک چلانی پڑی۔

کابل کی پیش کش :-

ہندوستان کے مسلمان دراصل اپنی غلطی کی تلافی کے لیے کسی موقعہ کی تلاش میں سرگرداں تھے کہ امیر امان اللہ خان والی افغانستان نے جو ابھی اپنے باپ امیر حبیب اللہ خان کے قتل کے بعد نئے والی بنے تھے۔ انگریز دشمن ہونے کی وجہ سے کسی موقعہ کی تلاش میں تھے۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ان کے چند ہندوستانی دوست جو ہندوستان سے ہجرت کر کے کابل میں پناہ گزین تھے اور ان دنوں امیر اور ہندوستانی مہاجرین میں گاڑھی چھنتی تھی۔ والئی افغانستان کو مشورے کا باعث بنے اور امیر امان اللہ خان نے ہندوستانی مسلمانوں کو انصاریت کی پیش کش کی اور ہندی مسلمانوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پیش کش قبول کر لی اور چند ایسے لوگ جن کے لیے ہندوستان کے اندر لیڈری کا موقعہ ناممکن تھا ہجرت کا جھنڈا بلند کر کے کابل پہنچ گئے۔ یہ تحریک مئی سے لے کر وسط اگست تک کابل میں داخلہ اور اس کے بعد ناکام واپسی پر منتج ہوئی اور جس طرح قافلہ در قافلہ داخلہ ہوا تھا۔ اسی طرح فوج در فوج واپسی ہوئی۔ مگر یہ ناکام واپسی مہاجرین اور ملک پر کئی سال تک اپنے برے نتائج کے ساتھ اثر پذیر رہی اور برطانیہ کو بعض ایسے جاسوس مفت میں دستیاب ہو گئے جو برطانیہ کروڑوں روپے صرف کر کے بھی حاصل نہ کر سکتا۔ خصوصاً وہ لوگ جو زیادہ جوش میں کابل سے آگے بخارا، خیوا، سمرقند تک اور افغانستان کے دور دراز حصوں میں جا پہنچے تھے نہایت کارآمد معلومات کے ساتھ برطانیہ کے استعمال میں آئے

لاہور میں ملازمت :-

آگے چلنے سے پہلے میں مختصراً اپنا حال قلم بند کرنا ضروری خیال کرتا ہوں تاکہ اس

تحریک کے پس منظر سے میرا تعلق واضح ہو سکے۔ ۱۹۱۴ء کے وسط دسمبر میں مجھے لاہور آنے کا موقعہ ملا۔ ابتداً عارضی ملازمت کے سلسلہ میں آیا تھا مگر وہ جنوری ۱۹۱۵ء سے گورنمنٹ سنٹرل ویونگ سکول شیراں والا دروازہ لاہور میں باقاعدہ ملازمت میں شامل ہو گیا۔ جہاں ہجرت کابل تک منسلک رہا۔ جب میں لاہور آیا تھا اس وقت میری عمر تقریباً اکیس برس ہو گئی تھی انڈسٹریل مڈل کی ہوئی تھی۔ تعلیم نہ ہونے کے برابر۔ مگر اخبار بینی کا شوق مجھے ۱۲ء ہی سے جب کہ زمیندار ابھی چھپا ہی تھا لگ گیا تھا۔ یہاں آکر اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ جوں جوں کام سے واقفیت بڑھتی گئی مجھے فرصت زیادہ ملنے لگی تو کئی کئی اخبار روزانہ دیکھنے لگا۔ جن میں ہندو اخبار بھی شامل ہوتے تھے۔ جب لالہ لاجپت رائے ہندوستان پلٹے اور انہوں نے بندے ماترم جاری کیا تو اسے میں نے بالالتزام دیکھنا شروع کر دیا۔ حکومت برطانیہ پر اس کی تنقیدیں بہت ٹھوس ہوتی تھیں۔ ادھر زمیندار میں مولانا ظفر علی خان صاحب کی جوشیلی نظمیں اور نثر نئے نئے ولولے ابھارنے کا باعث ہوتی۔ حتیٰ کہ حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ ہمارے دفتر سے ملحقہ مسجد شیراں والا دروازہ میں ورود فرما ہوئے اور آپ نے سلسلہ درس قرآن شریف جاری کیا اور جب اس میں ترقی ہوئی تو دو دفعہ مسجد کو بڑھانے کے باوجود مسجد اہل ذوق کو نہ سما سکی۔ یہ سب کچھ تو میری قابلیت سے برتر تھا مگر قرآن مجید کے درس سے مجھے بھی مستفید ہونے کا موقعہ ملتا رہا۔ مولانا ایک مخلص اور باعمل شخصیت کے مالک تھے۔ جب ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا تو مولانا موصوفؒ کا وصف عمل بروئے کار آیا۔ خود مولانا اور ان کے ہمراہ ان کے عقیدت مند جو مولاناؒ سے متاثر تھے تیار ہو گئے۔

بے نظم ہجرت :-

دراصل ہجرت کی آواز ۱۹۱۹ء کے دسمبر میں کانگرس اور خلافت کمیٹی کے مشترکہ پلیٹ فارم سے اٹھی تھی ۱۹۱۹ء کا سال حادثہ جلیانوالہ باغ امرتسر اور مارشل لا کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد کا سال تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو خلافت کی تائید اور مسلمان کانگرس کی تائید میں

کوشاں تھے۔ خلافت کی تحریک جو علی برادران کی زیر سرکردگی چل رہی تھی اور ادھر کانگریس بھی علی برادران کے جوش اور ولولے ہی سے متحدہ پلیٹ فارم کی حیثیت حاصل کر چکی تھی اور علی برادران ہی گاندھی جی کو اچھال کر حکومت برطانیہ کے لیے مشکلات کا باعث بنے تھے اس وجہ سے جب مولانا محمد علی علیہ الرحمتہ نے ہجرت کا نام لیا تو ہر طرف سے اس کی تائید کی گئی، انہی دنوں مولانا ابوالکلام آزاد نے مسئلہ خلافت نام کی ایک کتاب لکھی جس کے مطالعہ سے مسلمان قوم میں ولولہ تو پیدا ہوا لیکن وہ منظم نہ ہو سکی اور منتشر قوم کی بے نظم کوشش نہ صرف رائیگاں گئی بلکہ الٹا دشمن کے فائدے پر منتج ہوئی اور اس ناکامی اور نامرادی کی ذمہ داری جہاں کابل میں مقیم امیر افغانستان کے ہندوستانی مشیروں پر عائد ہوتی ہے وہاں ہندوستانی لیڈر بھی اس میں برابر کے شریک ہیں جنہوں نے تحریک ہجرت کے لیے کوئی نظم و ضبط قائم نہ کیا۔ اور مہاجرین میں ناکارہ اور نامناسب عنصر کی اکثریت اور برطانوی جاسوسوں کی ریشہ دوانیاں تحریک کی ناکامی کا باعث بنیں۔ اس میں شک نہیں کہ مہاجرین میں چھپ چھپا کر بعض کام کے آدمی بھی بچ بچا کر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا اس بے نظم ہجرت سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا جس کا ذکر اپنے موقعہ پر آئے گا۔

امرتسر سے روانگی :۔

یہ وضاحت نہایت ضروری ہے کہ راقم ہر حیثیت سے مولانا احمد علیؒ کے ہمراہیوں میں قابل ذکر شخصیت کا حامل نہیں تھا۔ تاہم میں نے بھی مولانا موصوف کے ہمراہ جانا ہی پسند کیا اور امرتسر سے اپنی بیوی کو ہمراہ لے کر لاہور سے قافلہ میں شامل ہو گیا۔ امرتسر سے میری روانگی کا عجیب عالم تھا۔ مہاجرین کی روانگی کا اس وقت عام رواج یوں چل نکلا تھا کہ کچھ لوگ جمع ہو کر ہجرت کرنے والوں کے گلوں میں ہار پہنا کر اور جلوس کی شکل اختیار کر کے ہاروں اور نعروں کے ساتھ بازاروں میں پھراتے اور ریلوے پلیٹ فارم پر بھی یہی نظارہ پیش کرتے اور ریل کی روانگی کے وقت خاص طور پر نعروں سے رخصت کرتے مگر ایک بے حیثیت فرد اس بوجھ کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ البتہ تانگہ میں سواری کے بعد

تا مذ نظر یاں کی ماننا نظارہ کرنی دکھائی دی۔ یا ہمسایہ ہونے کی حیثیت سے حضرت مولانا تو ساجد صاحب مغفور و مرحوم اور ان کے دو صاحبزادے مولانا داؤد مرحوم اور مولانا سلیمان صاحب بی۔ اے اور ان کے طالب علم عبد الغفور صاحب۔ ماموں زاد بھائی عبد الرحمٰن مرحوم۔ ان کے بڑے بھائی اور میرے بڑے بھائی موخر الذکر صاحب لاہور تک تشریف لائے اور سپیشل ٹرین میں سوار کرا کے واپس ہوئے۔

پشاور والوں کی مہمان نوازی :۔

یہ عجیب بات ہے ریلوے نے سپیشل طور پر لاہور سے اس قافلہ کے لیے گاڑی چلائی لاہور سے یہ قافلہ مولانا موصوف کے سندھی معتقدین کو شامل کر کے چھ ہزار کی تعداد میں روانہ ہوا تھا۔ اور سات ہزار افراد پشاور سے اس قافلہ میں شامل ہو گئے تھے اس طرح قافلہ کا نمبر ۱۳ تھا اور اس کے افراد ۱۳ ہزار تھے۔ پشاور میں قافلہ کی روانگی کے انتظام کے لیے تین دن رکنا پڑا۔ مگر پشاور میں میاں حاجی جان محمد خان اور ان کے ہمراہیوں کی مہمانداری اور خدمت قابل داد تھی۔ کاش کہ جتنا نظم پشاور میں دیکھا گیا تھا۔ اتنا بھی اس سے آگے دیکھنے میں آتا۔ کاش پشاور کے منتظم جہاں مہمانوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے لیے اتنی کوشش کر رہے تھے۔ وہ تھوڑا سا غور رہ پر داخت اور ہجرت کے لیے مناسب افراد کے انتخاب کو بھی ہاتھ میں لے لیتے تو شاید اتنی ناکامی کا سامنا نہ ہوتا مگر ایسا نہ ہو سکا بلکہ ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو پشاور کے مہمانخانہ میں پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ چاہے پشاور سے روانگی کے وقت اس کے پاس ایک وقت کی روٹی کے لیے بھی دام نہیں تھے وہ بھی راستے کی اور پشاور کی مہمانداری کے طفیل کابل جا پہنچا۔ جہاں کسی شخص کی ایک وقت کی روٹی کا بھی انتظام موجود نہیں تھا۔ مہاجرین کی اس فاقہ کشی کا حال جب ہند میں کھلا تو مجھے یاد ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے امرتسر کے بڑے جلسے میں علی برادران سے سخت الفاظ میں احتجاج کیا کہ آپ لوگ یہاں کاروں پر چڑھے جلوسوں میں مصروف ہیں۔ کابل میں مہاجرین لاوارث اور بھوکے مر رہے ہیں۔ اس تلخ حقیقت کے اظہار سے شاید کوئی قدم

پر بہت نازاں ہوں۔ مگر نظم کے فقدان کے باعث کوئی شخصیت اس کے اثرات بہت دیر تک محفوظ نہیں رکھ سکی۔ اور ایسا ہی اس حالت میں ہونا تھا جو کہ ہو کر رہا۔

پشاور سے روانگی :-

جب ہمارا قافلہ پشاور سے روانہ ہوا تو امیر قافلہ حضرت مولانا احسان کے چند صاحب ثروت ہمراہی تانگوں میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ اور باقی قافلہ کی اکثریت پیدل اور کچھ اوسط درجہ کی بیل گاڑیوں میں روانہ ہوا۔ اور چند روز میں یا سولھویں دن کابل جا پہنچے۔

اپنی بیوی کی بیماری کی وجہ سے میں بیل گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ اتفاق سے آخری دن ہماری گاڑی کا بیل بیمار ہو گیا۔ اور کابل سے کچھ دور بت خاک کے قریب سڑک کے کنارے ہمیں رکنا پڑا۔ وہ رات بھی عجیب تھی ہم قافلہ سے بچھڑ چکے تھے۔ گاڑیبان اگرچہ پشتو تھا مگر جہاں گاڑی رکی پڑی تھی۔ اول تو آبادی ہی وہاں سے دور تھی ساتھ ہی اس آبادی میں پشتو جاننے والے ناپید تھے۔ سر شام ہی ہمیں اشاروں میں ڈرایا گیا کہ تمہارا یہاں رات گذارنا نہایت مہنگا پڑے گا۔ تم آج رات ضرور کسی حادثے کا شکار ہو کر رہو گے اور ہم میں سے ہر شخص اپنے اپنے خیال اور ہمت کے مطابق سوچ میں پڑا چپ چاپ اور حیرانی میں مبتلا تھا۔ ہماری بساط ہی کیا تھی ایک گاڑی بان ایک مجرد جس نے فقط اپنا سامان گاڑی میں رکھا ہوا تھا اور چار مرد عیالدار جن کے ساتھ ایک بیمار عورت، دو حاملہ عورتیں اور ایک چند ماہ کا بچہ گود میں لیے چار عیالداروں کی کمزور سی ان کی عورتیں تھیں۔ اس کے علاوہ ہم سب نہتے تھے۔

بیوی کی شفایابی :-

کابل کے راستے میں اب کوئی پہاڑ نہیں میدانی سڑک جس کے ارد گرد دور نزدیک چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے۔ کابل خیال میں آنکھوں کے سامنے نظر آ رہا تھا مجھے تو خاص طور پر خوشی تھی کہ میری بیوی کا بخار ٹوٹ چکا تھا اور اس نے اصرار کر کے شفاف پانی

کی ایک چھوٹی سی آب جو پر پردہ کرا کر غسل کیا تھا۔ یہ ایک عجوبہ ہی تھا کہ پشاور سے روانگی کے وقت وہ صاحب فراش تھی اور پشاور سے ڈکہ تک اس نے سوائے اس شربت کے چند گھونٹ کے جو اس کے لیے احتیاطاً رکھ لیا گیا تھا۔ وہ اور کچھ چکھ تک نہ سکی تھی جس کے زندہ کابل تک پہنچنے کی امید بھی نہ تھی۔ ڈکے پہنچ کر تربوز کی خواہشمند ہوئی جو بڑا فراط میں بک رہے تھے اور ڈکے سے بت خاک تک تقریباً دس گیارہ دن تک فقط تربوز ہی اس کی دوا خوراک تھی۔ آج منع کرتے کرتے نہانے پر بضد تھی اور نہا کر ہی مانی۔ میرا خیال تھا کہ شاید قبل از مرگ بیماری سے مہلت ہے۔ شاید اس غسل کا کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ مگر جسے خدا رکھے اسے کون چکھے۔ آج جب کہ یہ واقعہ سپرد قلم کر رہا ہوں۔ بقید حیات ہے۔ ماشاء اللہ چار جوان بیٹوں کی ماں ہے اور بارہ پوتوں اور پوتیوں کی دادی ہے۔

قافلہ کا آخری پڑاؤ

ابھی ہم بت خاک میں پریشانی میں مبتلا تھے اور میں جو ہر واقعہ سے قوموں کے عروج وزوال کے فلسفے کو سوچنے کا عادی تھا۔ میں اپنے قافلے کے نظم اور بدنظمی کے وہم میں مبتلا پشاور سے قافلہ کی روانگی امراء کا بذریعہ سواریاں الگ ہونا اور قافلہ کا بے سر سامان رہ جانا اور ہر قیام پر جوا، چرس، چندہ اور اس کے نتائج سے قافلے کا دو چار ہونا غرض قافلے میں وہ سب کچھ تھا جو شہروں کی گندگی میں ممکن ہو۔ مگر نہیں تھا تو وہ وقار جس کی تحریک ہجرت طالب تھی اور نہ ہی تنظیم اور کوئی برکت۔ میں سوچ رہا تھا صرف ایک دن گاڑیبانوں نے اپنی تنظیم اور اتحاد کا مظاہرہ کیا تھا۔ جس کی برکت سے بغیر کسی نقصان سے قافلہ ایک بہت بڑے حادثے سے بچ نکلا۔ شام ہو چکی تھی۔ اندھیرا چھا رہا تھا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی سلطان پور، جلال آباد سے ایک پڑاؤ آگے ہے۔ قافلہ شام سے ذرا پہلے چلا تھا۔ سڑک سے جنوبی پہاڑیوں سے ایک برساتی نالہ جو پہاڑیوں پر بارش کی وجہ سے اس وقت رواں ہو چکا تھا اور خیال تھا کہ اگر او رانتظار کیا گیا تو پانی بڑھ کر بہت تکلیف کا باعث ہو گا بلکہ اس مشورہ کے دوران ہی میں پانی کافی تیز ہو گیا تھا۔ اور اگر گاڑیبان اپنی اپنی اکیلی گاڑی

میں ڈالتے تو شاید ایک بھی گاڑی پانی کی اس تیزی کا مقابلہ نہ کر سکتی۔ مگر ایک سرے سے تمام گاڑیاں
سب کی متفقہ ہمت سے بخیر و خوبی پار اتر گئیں اور باقی رات سفر جاری رہا۔ مجھے وہ نقشہ
آنکھوں کے سامنے دکھائی دے رہا تھا کہ جب ہماری گاڑی جو سب سے پیچھے تھی اور
پانی کافی تیز ہو چکا تھا کس طرح دو تین دفعہ پانی نے اٹھالی۔ مگر متفقہ کوشش کو خدا نے کامیاب
فرمایا۔ کتنا صحیح اور سچ ہے فرمودہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "اللہ فوق الجماعۃ" جماعت پر اللہ
کا ہاتھ ہوتا ہے۔

ہجرت سے واپسی:-

ابھی میرے ساتھی بھی اپنے اپنے خیال میں محو جاگ رہے تھے کہ بارہ بجے کے قریب
کابل کی طرف سے کچھ لوگ سڑک پر آتے نظر پڑے۔ جب وہ قریب پہنچے اور ان کی باتوں
کی آواز کان میں پڑی تو ایسے معلوم ہوا جیسے کان اس آواز سے پہلے ہی آشنا ہیں۔ کیونکہ ان میں
کچھ لوگ پنجابی میں گفتگو کر رہے تھے۔ جب وہ لوگ ہمارے برابر پہنچے تو ہمارے سوالات
پر انہوں نے بتایا کہ ہجرت واپس ہو گئی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ دن میں جب ہمارا قافلہ کابل
پہنچا تو اسی وقت ایک بھاری جلسے کا نقشہ بن گیا اور اس میں سرحدی اور پنجابی جوشیلے
نوجوانوں نے امان اللہ خان (مراد حکومت افغانستان) سے مطالبہ کیا کہ ہمیں اسلحہ دیا جائے
تاکہ ہم فرنگی پر حملہ آور ہوں جس کے تسلیم نہ کیے جانے پر ہم لوگ واپس ہو رہے ہیں۔ اور
بعض نے بتایا کہ کابل میں کوئی انتظام نہیں کوئی پوچھتا نہیں۔ مہاجر بھوکے پڑے ہیں اور ہم
اسی وجہ سے واپس ہو رہے ہیں۔ یہ کچھ سن کر میرے ساتھی بولے کہ ہم لوگ یہیں سے واپس
لوٹ چلیں۔ میں نے کہا کہ یہ لوگ تو کابل کو ہاتھ لگا آئے ہیں ہم کابل کو ہاتھ تو لگا لیں اور
بت خاک سے کابل کو سواگئی تک بھانت بھانت کی بولیاں سنتے وقت کٹی۔ مایوسی وقت
کے ساتھ برابر بڑھتی رہی۔ بلکہ جوں جوں صبح قریب ہو رہی تھی واپس ہونے والوں کی تعداد
میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اب میں تحریک کی ناکامی کے نتائج کا جائزہ لے رہا تھا۔ جو لوگ اپنی
جائدادیں اونے پونے بیچ آئے تھے ان کا کیا بنے گا اور اب واپس جانے والے لوگ

مذہب اور اسلام کے متعلق کیا رویہ اختیار کریں گے جب کہ ان کی معلومات سطحی ہیں انسان کو ناکامی
کے اسباب کا اندرونی خاکہ بالکل دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ ان کو یہ تک معلوم نہیں کہ کس طرح فرنگی
کے جاسوسوں نے جو لیڈروں اور مولویوں کے شفاف جاموں میں چھپے ہوئے تھے کابل کے
نہایت گندی قسم کے جاسوسوں کے ساتھ مل کر ان باغیوں میں پانی چھڑوا دیا تھا جہاں زیادہ سامان
مہاجرین کے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ اور مہاجرین میں یہ کہہ کر مبالغہ مچا دی تھی کہ یہ ہمارے
دشمن ہیں جو ہمیں یہاں دیکھنا نہیں چاہتے بلکہ یہ فرنگیوں کے تنخواہ دار ہیں اور کابلیوں سے
یہ جھوٹ کہلوائے تھے کہ یہ لوگ ہجرت کر کے آرہے ہیں آپ ہمارے غلے اور میل ختم کریں گے
حالانکہ افغان خود بھی مہمان نواز ہوتے ہیں جس کا ذکر اپنے موقعہ پر آئے گا۔ انہی خیالوں کے
ساتھ علی الصبح کابل کی طرف روانہ ہوئے اور تمام راستہ واپس آنے والوں کے انبوہ سے
سابقہ پڑتا رہا۔ اسباب ان کی بولیاں جاتی پہچانی ہو چکی تھیں۔ وہی چند جملے جو فرنگی
جاسوسوں نے کابل کے حالات کے متعلق ان کے منہ میں ڈال دیئے تھے سنتے چلتے
تھے اور بس۔

مہاجرین کی حالت :۔

دس اور گیارہ بجے کے درمیان ہم کابل پہنچے۔ ہماری گاڑی کو ہمارے قافلے کے
ساتھیوں کی قیام گاہ کی طرف رہنمائی کی گئی اور ہم شہر کابل کے جانب جنوب کی طرف چند
فرلانگ کے فاصلے پر سرائے نرخن وال کے دروازے کے سامنے آ اتار دیئے گئے۔ اس
کے شمال مشرقی کونے پر بڑا دروازہ سرائے میں داخلہ کے لیے کھلا تھا اور اندر فراخ
صحن کے درمیان ایک کنواں تھا اور چاروں طرف کوٹھڑیاں پھیلی ہوئی تھیں جن کے
آگے ایک برآمدہ تھا اور اسی طرح دوسری منزل پر کوٹھڑیاں اور برآمدہ تھا۔ ہمیں اوپر
کی منزل میں کوٹھڑیاں مل گئیں۔ بعض کوٹھڑیوں میں دو دو چار چار ٹھہرے۔ بیوی کو اوپر بٹھا کر
جب میں ایک ٹرنک اٹھائے سرائے کے دروازے میں داخل ہو رہا تھا تو دو نوجوانوں
کو ڈیوڑھی کے پلیٹ فارم پر مصروف گفتگو پایا۔ دونوں متفقہ طور پر واپسی کے

مخالف تھے مگر بے خرچ ہونے کے سبب واپسی پر غور کر رہے تھے۔ آدمی لداخ سے واپس ہونے والوں کی بولیوں میں سے ایک بولی یہ تھی جس میں ان نوجوانوں کی زبانی سن رہا تھا۔ انہیں ایک وقت کی روٹی کا خرچ میں نے دے دیا اور کہا۔ کھانا کھا کر مجھے پھر ملیں اپنا سامان قیام گاہ میں رکھ کر میں نے اسی امر کو وقت کا کام سمجھا کہ حتی الوسع واپسی کے آگے جتنا بند باندھ سکو باندھ لو۔ ہمارے ساتھیوں میں ایک عیالدار ایسا تھا جن کے پاس گاڑی کا کرایہ دے کر کوئی پیسہ نہیں بچا تھا۔ راستہ بھر اس کا گذارہ جس طرح بھی ہوا ہو گیا۔ جس کا کسی کو سوائے اس کے یا میرے کسی کو علم نہیں۔ اب اسے میں نے کچھ روپے دیئے۔ تاکہ وہ کسی کے پاس اپنے خرچ کے متعلق نہ کہے اور نیچے اتر کر ایک جگہ چند اہل ثروت اصحاب جمع کر کے اپنا مقصد ان کے سامنے رکھا۔ وہ لوگ متفق ہو گئے اور کچھ پیسے جمع ہو گئے جو بالاتفاق انہوں نے میرے حوالے کر دیئے۔ ایک مہاجر نے ایک امرتسری خاتون کی چاندی کی کچھ چیزیں مجھے دیں جو اس نے اسی غرض سے دے دی تھیں کہ کابل میں نادار مہاجرین کے مصرف میں لائی جائیں۔

مہاجرین کا انتظام:۔

شام کے کھانے کے وقت سے پہلے پہلے ان دو نوجوانوں کے علاوہ سرائے میں سے تقریباً چالیس مرد بچوں کے درمیان مہاجرین کی فہرست میں نے تیار کر لی۔ اور ان کے لیے روٹی سالن بازار سے لا کر ان میں تقسیم کر دیا۔ دوسرے دن میرے عیالدار ساتھی کو ایک شخص جو آتی دفعہ بھی تانگہ میں آیا تھا جاتی بار تانگہ میں سوار کر کے لے گیا مگر اس کے بعد سرائے میں سے کوئی نادار واپس نہ لوٹا۔ اگرچہ دولتمند جو تھوڑے تھے وہ نہ رک سکے۔ اول، اول میں روٹی تقسیم کرتے وقت روٹی لینے والوں کو مختصراً یوں عرض گزار ہوتا کہ امداد خود مہاجرین نے اپنا پیٹ کاٹ کر نادار مہاجرین کے لیے دی ہے۔ کسی مقامی انجمن یا ادارہ یا حکومت کی معاش امداد میں شامل نہیں۔ اس لیے وہ مہاجرین جو اپنے پاس کچھ اثاثہ رکھتے ہیں اس میں ہاتھ نہ ڈالیں۔ تیسرے چوتھے دن مجھے چند لوگوں کی شکایت ملی کہ

وہ کئی سو روپیہ اپنے پاس رکھتے ہوئے اس امداد کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مگر میں ان کو پہلے دن کے الفاظ دہرانے کے سوا کچھ نہ کہہ سکا۔

سرائے نرنجن کی کوشش :-

سرائے نرنجن میں ایک ادنیٰ سی کوشش تھی۔ مگر اس کی کامیابی کی خبر کابل بھر میں پھیل گئی اور ایک دن حضرت مولانا بشیر مرحوم و مغفور سرائے میں تشریف فرما ہوئے۔ اتفاق سے سرائے میں لاہور کے چند اصحاب جو مولانا سے اچھی طرح آشنا تھے مقیم تھے۔ مولانا انہیں کے پاس بیٹھے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ فرما رہے تھے۔ جس کا ہر جملہ دل میں اترتا اور اپنا اثر چھوڑتا نیا جوش اور امنگ پیدا کرتا تھا۔ چونکہ میں خود لیڈر یا دولت مند نہیں تھا ان سے متعارف نہیں ہو سکا۔

ہجرت کی ناکامی کے اسباب :-

سرائے میں امداد کا سلسلہ جاری تھا جو محض خدا کے بھروسے چل رہا تھا۔ باقی مقامات سے واپسی جاری تھی۔ مگر اس کی رفتار مدھم پڑ چکی تھی۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ وہ لوگ جو بہت ہی لاچار تھے وہ جا چکے تھے۔ اب اکثریت تو جا چکی تھی۔ اقلیت کے لیے کچھ انتظامات کی امید بندھ رہی تھی۔ اگرچہ بعد میں وہ بھی موہوم ہی رہی اور خال خال افراد کو چھوڑ کر باقی سب لوگ واپس آ گئے ادھر پشاور سے قافلے روانہ ہو رہے تھے جو اس وقت تک روانہ ہوتے رہے جب تک واپسی والے لوگ پشاور پہنچ کر کابل کے حالات واشگاف ہونے کا باعث نہ ہو گئے۔ اگرچہ ہجرت کی ناکامی کا زیادہ تر فرنگی جاسوسی کا جال ذمہ دار تھا۔ مگر اس ناکامی میں ہندوستان کے لیڈر اور کابل کے لیڈر شیر اور خود حکومت افغان اور مہاجر لیڈر بھی برابر کے شریک تھے بلکہ اگر زیادہ تنقیدی نگاہ سے دیکھا جائے تو دشمن کی ذمہ داری تو صرف اتنی ہی ہے کہ اس نے ایک غیر منظم قوم کے کمزور پہلوؤں کا صحیح مطالعہ کر کے انتشار اور کمزوری سے فائدہ اٹھایا

اور شاید یہ اس کا حق تھا۔ دشمن اگر مخالف کی کمزوری سے فائدہ نہ اٹھائے تو اس کو بے وقوف
کہا جائے گا۔ یہ سوچنا کہ دشمن ہماری کمزوری سے فائدہ اٹھائے گا تحریک کے محرکوں کا کام ہے۔
یہاں تو سرے سے اخلاص اور تنظیم کو نزدیک تک نہیں آنے دیا گیا۔

رہنماؤں کا کردار:۔

ہندوستان کے لیڈروں نے یہ نہ سوچا کہ جس طریق سے تحریک کو چلا رہے ہیں اس کا
انجام کیا ہوگا۔ اور کابل کے ہندوستانی لیڈر یہ تک نہ کر سکے کہ فرنگی جاسوس باغوں میں پانی
چھڑوا کر اور بے بنیاد افواہیں پھیلا کر مہاجرین کو بدول کر کے بھگا رہے ہیں۔ ان کا انتظام کرتے
اور آنے والوں کے لیے کام اور مشاغل کا انتظام کرتے اور خود مہاجر لیڈر جن کو حکومت
اور اعیانِ حکومت اور رؤسا سے یا اپنی جیب سے پلاؤ اور قورمہ دستیاب ہو جاتا تھا وہ
عوام میں جا کر ان کو تھپکی تک نہ دیتے۔ بلکہ انھوں نے اپنی ناسمجھی اور سنگدلی کا مظاہرہ اس
وقت میں کیا جب کہ معاملہ نہایت نازک تھا۔ سوائے چار مخلص اصحاب حضرت مولانا بشیر شہید،
مولانا احمد علی صاحب۔ خان عبد الغفار خان صاحب، ارباب رضا خان صاحب مرحوم
کے باقی کوئی صاحب بھی اپنی ہٹ اور رہنمائندگی کا چولہ اتارنا نہیں چاہتا تھا۔ جو آخر
تحریک کی ناکامی نے سب کے بدن سے اتار پھینکا اور وہ اپنی ہی کوششوں سے آپ
ننگے ہو گئے۔ تیس لیڈروں کی کمیٹی یہ فیصلہ بھی نہ کر سکی کہ آل انڈیا نمائندہ کون تھے مزید
اچھا یہ تھا کہ جھگڑا چند ہندوستان سے نئے آنے والوں اور حکومتِ افغان کے ان
مشیروں میں تھا جو ۱۹۱۵ء سے مفرور کی حیثیت سے حکومت کی پناہ میں تھے۔ چونکہ وہ
پہلے سے بحیثیت ہندوستانی نمائندہ کے کابل میں مقیم تھے اور ہجرت کی دعوت حکومت
نے ان ہی کے ایما اور مشورے سے دی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہم ہی محرک اور ہم ہی تحریک
کے بانی ہیں اگرچہ آنے والوں کے لیے ہم نے کچھ بھی نہیں کیا۔ مگر ہماری نمائندہ حیثیت کو
چیلنج کرنے کا حق کسی کو نہیں اور سوائے چار کے نئے آنے والوں کہتا تھا کہ ہندوستان
سے ہجرت ہذا کے نمائندہ ہو کر ہم آئے ہیں اس لیے مہاجرین کے نمائندہ ہم ہیں۔ آپ

زیادہ سے زیادہ یہاں انصار ہیں اور لیکن مہاجر تھے کہ بھوکے ننگے واپس ہو رہے تھے۔

لیڈروں کی بد انتظامی:۔

اگر کچھ ہوا تھا تو یہ کہ عیدگاہ کے میدان میں کچھ لیڈر آتے اور مہاجرین کو فرماتے کہ فوج میں ملازمت یا فیض آباد بدخشاں کی طرف زمین یا کارخانہ شاہی میں ملازمت یا کسی آزاد پیشہ یا دوکانداری کے لیے نام لکھوائیے اور ہر ایک لیڈر ایک شعبے کے لیے نام لکھتا اور بوقت رخصت کل ہیں، اگر مزید معلومات کیلئے وقت دیا جاتا مگر دوسرے دن جب لوگ شعبے کے لیڈر کو بعد از تلاش مل جاتے تو لیڈر صاحب فرماتے کہ آج میرا شعبہ بدل دیا گیا ہے اگر آپ میرے معرفت ہی روزگار تلاش کرنے کے خواہاں ہیں تو آپ میرے آج کے شعبے میں نام لکھوائیے۔ اس پر مجبور لوگ چلے جاتے اسی لیڈر کے متعلقہ شعبہ کے لیے نام لکھواتے اور جو لوگ چاہتے وہ اپنے متعلقہ شعبے کے لیڈر کی تلاش کرتے اور اگر کامیاب ہو جاتے تو نئے سرے سے نام لکھواتے اور پھر اگلے دن وہی قصہ نئے سرے سے دہرایا جاتا کیونکہ لیڈروں کے شعبے ہر روز تبدیل ہو چکے ہوتے۔ چنانچہ زرنجن سرائے والے مع میرے کئی دن خراب ہوئے مگر انھوں نے فیض آباد میں زمین حاصل کرنے ہی کا پروگرام رکھا۔ اگرچہ لیڈر کتنے ہی تبدیل ہوتے گئے۔

قافلے کی روانگی:۔

کابل میں پہنچنے کے بعد بائیس دن تک امداد کا سلسلہ جاری رہا اور خدا کی مہربانی کہ ادھر ہمارا سرمایہ ختم ہوا ادھر ہمیں اطلاع دی گئی کہ زرنجن سرائے والے لوگ آج سے آٹھ دن بعد فیض آباد بدخشاں بھیج دیے جائیں گے۔ اور آج سے ان کو سرکاری رسد ملے گی جو اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ یہ لوگ اپنی زمینوں کے غلہ وغیرہ حاصل کر لیں۔ چنانچہ اسی دن سے ایک ہفتہ کے لیے صرف آٹا ملے گا۔ مگر آٹا گندم کا اتنا ہوتا کہ ہفتہ بھر کے لیے آٹا بچا کر بقایا کو بیچ ڈالا جاتا اور باقی ضروریات پوری ہو جاتیں۔

حتیٰ کہ وہ دن آگیا۔ جب کہ قافلہ کے لیے اونٹ مع کجاووں کے سرائے میں پہنچ گئے۔ اور ہم لوگ خوشی خوشی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ جب ہمارا سامان تیار ہو چکا اور عورتیں برقعے پہن کر سواری کے لیے بڑھیں تو عین اسی وقت ایک شخص سرائے میں داخل ہوا اور میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا کہ تم آج اس قافلہ کے ہمراہ نہیں جا سکتے۔ بلکہ کل کسی دوسری جانب روانہ کیے جاؤ گے۔ یہ خبر سن کر قافلے میں سراسیمگی سی پھیل گئی۔ ہم لوگ اب بھائیوں کی طرح زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک خدمت گذار کو علیحدہ کیا جا رہا تھا۔ جسے کوئی بھی خوشی سے قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ مگر یہ حکم چونکہ حضرت مولانا احمد علی صاحب کی طرف سے تھا جن کا احترام ہم سب پر واجب تھا اس لیے ساتھیوں کو کچھ گفتگو کے بعد اطاعت کی رغبت ولائی قافلہ جناب مولوی عبدالحنان صاحب جو سرائے کے مقیموں میں سے ایک نیک دل عالم تھے ان کی زیرِ سرکردگی روانہ ہو رہا تھا۔ تین اور عیالداروں کے سوا سب تیار ہو گئے۔ اور قافلہ دعا کے بعد روانہ ہو گیا۔

میری چمرکنڈ کی طرف روانگی :۔

اس واقعہ کا پس منظر ناظرین کی آگاہی میں اضافہ کے لیے ضروری معلوم ہو رہا تھا۔ جو کچھ اس طرح سے ہے۔ میں غریب طبقہ کا ایک نفر تھا۔ جو اپنے روزگار کے حصول کے لیے مجبور تھا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ جب سب طرف سے مایوسی ہو چکی تو میں نے ایک دن مولانا احمد علی صاحب کی خدمت میں اپنے لیے کسی روزگار کا ذکر کیا۔ اتفاق سے اسی وقت مولوی برکت اللہ صاحب جو گوجرانوالہ کے رہنے والے تھے اور کابل کے باشندے تھے اور کابل کے گورنمنٹ پریس میں ملازم تھے۔ وہ مجھے افغان گورنمنٹ کے کپڑے کے کارخانے میں لے گئے۔ اور وہاں کے افغانی منتظم سے میرا تعارف کرایا۔ مگر افغانی افسر نے کچھ تسلی بخش جواب نہ دیا۔ مولانا بشیر صاحب جو ان دنوں عین العمارت میں مقیم تھے ایک دفعہ میرا ان کے ہاں جانے کا بھی اتفاق ہوا تھا۔ جہاں مرتضیٰ احمد خان میکش صاحب کو بھی دیکھا۔ غالباً وہ اپنے کو مولانا بشیرؒ کے ذریعے جماعت مجاہدین سے منسلک کر چکے تھے

اور وہیں ان کے پاس مقیم تھے اور اکثر لیڈر عموماً مولانا موصوف کے پاس تسکین ناطر کے لیے آتے جاتے تھے۔ کیونکہ مہاجرین کے لیے یہ جنس یعنی تسکین کابل میں جس فراوانی سے عین العمارت میں میسر آتی تھی، اتنی اور کہیں نہیں ملتی تھی۔ دوسرے بڑے بڑے لیڈر رہتے کہ بہت بڑے مدعی بھی یہ جنس صرف اپنے ہی لیے تسکین چاہتے تھے۔ دوسروں کو بانٹنے کے وہ قائل ہی نہیں تھے۔ عین العمارت میں عوام مہاجرین کی حالت پر تبصرہ کے دوران میں زرتجن کی سرائے کا ذکر کہیں چھڑ گیا تو مولانا برکت اللہ صاحب جو نہایت ہمدرد دل رکھتے تھے اور مہاجرین کے لیے بہت دلچسپی لیتے تھے۔ انہوں نے میرا تعارف ایک مکینک کی حیثیت سے اس مجلس سے کرا دیا کہ ایک کپڑے کی مشینوں کا مکینک زمینداری کس طرح کرے گا۔ چنانچہ مولانا بشیر مرحوم و مغفور نے مولانا احمد علی کے ذریعہ حکم بھجوا کر مجھے رکوا لیا۔ اور خدا نے ان کو اس قدر متوجہ کیا کہ جب میں نے خود ان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں اکیلا نہیں ہوں بلکہ تین اور عیالدار ساتھ ہیں تو انہوں نے کمال کشادہ دلی کا اظہار فرمایا۔ اور کہا یہ اور بھی بہتر ہے ہم چاروں عیالداروں کے چمرکنڈ روانہ کرنے کا بندوبست کریں گے۔ اور قافلہ کی روانگی کے اگلے دن ہم چاروں عیالدار اپنے مالدار ساتھی (جو پشاور میں گاڑی میں بھی ساتھی تھا) کی زیر سرگردگی ایک نیک دل مجاہد سعد بھائی کی معیت میں چمرکنڈ کو روانہ ہو گئے۔ چمرکنڈ کو جاتے ہوئے دوران سفر میں ہمارے میر قافلہ نے ذکر کیا کہ وہ مجاہدین کا پہلے سے رازدار ہے اور ہماری چمرکنڈ کو روانگی میں اس نے بھی مولانا بشیر صاحب سے ملاقات کر کے حصہ ڈالا ہے۔

اشتیاق کا عالم :-

ساتویں دن ہم واپس جلال آباد پہنچے جہاں سے چمرکنڈ جانب شمال تین میل کے سفر پر واقع ہے۔ جس سرائے میں ہم جلال آباد پہنچ کر فروکش ہوئے۔ اتفاق سے وہیں پر چند مجاہد اسی دن ہم سے قبل پہنچ چکے تھے جو وزیرستان جہاد میں شمولیت کی غرض سے جا رہے تھے۔ ان سے تبادلہ خیال سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ کیونکہ ابھی تک مجاہدین

کے نظم وضبط اور اخلاص کے متعلق علم نہیں تھا۔ ہجرت کی ناکامی اور قوم کے انتشار سے جو بے چینی اپنی طبیعت پر ہر وقت طاری رہتی تھی قدرے اس سے نجات ملی۔ اس قافلے کے ایک رکن مولوی یونس صاحب سے جمعیت مجاہدین کے مختصر حال سن کر سمندرِ شوق کو اک اور تازیانہ لگا۔ بہت جلد چمر کنڈ پہنچ جانے کو دل چاہتا تھا تاکہ اپنی آنکھوں سے وہ نظارے دیکھیں جو اس نوجوان مجاہد نے الفاظ میں کھینچے تھے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ چمر کنڈ کے تذکرے پہلے میں اپنے ناظرین کو اس خط میں شرکت کا موقع دوں جو مجھے اس نوجوان کی باتوں سے حاصل ہوا۔ اب اس شخص کے جذبات اور احساسات کا اندازہ کریں جو وطن سے نکل کر گذشتہ ذکر کیے حالات سے دوچار رہا ہو اور اسے ایسے وقت ان ہستیوں کی اس دنیا میں موجودگی کی بایں الفاظ خبر دی جائے۔ تم نے کتابوں میں صحابہ کرام کے حالات پڑھے ہوں گے۔ مگر عنقریب تم ان کی نقل اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔ لشکر کے امیر کو پہچاننے کی سوائے ایک صورت کے دوسری صورت ممکن نہیں کہ اس کی عمر سب سے بڑی ہے اور مجاہدین آپس میں بھائیوں کی طرح سلوک کرتے ہیں اور اسلام کے لیے اخلاص کے مجسمہ ہیں اس کی تصدیق تو ہمارے سامنے سعد بھائی کے نمونہ میں پائی جاتی تھی۔ وہ نوجوان تیس ۳۰ برس کے قریب ہوگا مگر عالم نہ ہونے کے باوجود جوابات بھی کرتا معلومات اور اخلاص سے بھرپور اس کا لب ولہجہ مشفقانہ اور سلوک برادرانہ کتنا پیارا تھا۔

سفر کی آخری منزل :۔

جلال آباد میں ہمیں تین دن رکنا پڑا کیونکہ کابل سے جو خچریں ہم ہمراہ لائے تھے وہ جلال آباد تک کے لیے تھیں اس کے آگے جانے کے لیے بار برداری کے جانوروں کا انتظام کرنا تھا وزیرستان جانے والے مجاہد بھی اسی دن روانہ ہوئے جس دن ہم چمر کنڈ کی طرف روانہ ہو رہے تھے جو مہاجر واپس ہوتے تھے ان کو واپسی بہت مہنگی پڑ رہی تھی۔ جو لوگ جاتے وقت اُن کے لیے فرش راہ بنتے تھے۔ اور حتے المقدار قافلوں کو پھلوں اور پلاؤ قورمے سے تواضع کرتے تھے واپسی پر وہی لوگ مہاجرین کے کپڑے تک نہیں چھوڑتے تھے

ہمارا قافلہ سالار جو ہزار بارہ سو روپیہ اپنے پاس رکھتا تھا اپنے قافلہ کے بھی لٹ جانے کا خوف کھا رہا تھا۔ مگر ہم لوگ چونکہ وطن واپس نہیں لوٹ رہے تھے بلکہ آزاد سرحد میں آباد ہونے کیلئے جا رہے تھے۔ مامون تھے ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا نیز ہمارے ساتھ دو پشتون جو مجاہدین کے لشکر کے رکن تھے۔ جلال آباد سے ہمارے سفر شریک ہو گئے تھے۔ یہ دونوں وزیرستان جانے والے مجاہدین کے ہمراہ جلال آباد تک آئے تھے اور واپسی پر ہمارے ساتھ جا رہے تھے۔ وہ ہر شخص کو جو ہمیں واپس جاتے دیکھ کر اپنی بدنیتی کا مظاہرہ کرنا چاہتا۔ اسے سمجھا کر باز رکھتے بلکہ وہ ہماری اور عزت افزائی کا ذریعہ ہوتے جلال آباد سے امرتسر کے ایک بندوق ساز بھی ہمارے ساتھ چمرکنڈ کے لیے جا رہے تھے۔ تین دن سفر کر کے ہم سرکانی پہنچے جو چمرکنڈ سے چھ میل اس طرف افغانستان کی آخری فوجی چھاؤنی تھی۔ وہاں پر ایک بزرگ میاں صاحب سرکانی صاحب کرامات تھے۔ ان کے ہاں مسافروں اور اُن کے ملنے والے مریدوں کے لیے لنگر جاری تھا۔ یہ جگہ دریائے کنڑ کے کنارے چمرکنڈ سے جلال آباد جانے والے راستے پر پڑتی تھی۔ یہاں پر ہمارے کرایہ کے جانور رخصت کر دیئے گئے اور دونوں پشتون چمرکنڈ میں خبر کرنے اور وہاں سے لشکر کی خچریں بھیجنے کے لیے چلے گئے اور یہ دن ہم نے سرکانی ہی میں بسر کیا اور میاں صاحب مذکور کے کشف و کرامات کے تذکرے سنا کئے۔ میاں صاحب ہاڈا صاحب رحمت اللہ علیہ کے چوٹی کے مریدوں میں سے ایک تھے۔ یہاں پر مختصر سا حال ہاڈا صاحب کا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ہمارے سوانح میں اکثر اس بزرگ ہستی کا ذکر بھی آئے گا۔ اس لیے ان کے مختصر سوانح حیات سے آگاہی ضروری ہے۔

ملا صاحب ہاڈا رحمۃ اللہ علیہ

حضرت ہاڈا صاحب ایک مخلص شیدائی خدا اور رسولؐ اور غازی مرد گذرے ہیں۔ ابتدا میں آپ ملا صاحب صاحب سے بیعت ہوئے جو شمالی پاکستان میں بہت بڑی ہستی شمار ہوتے ہیں۔ آپؒ کے لکھوکھا مریدوں میں سے یہ دو بزرگ ایک ہاڈا صاحب جو سمت

مشرقی افغانستان اڈہ ملا صاحب کے بعد تقریباً تمام ہی یاغستان پر اپنے وقت کے روحانی پیشوا مانے جاتے تھے اور صوبہ سرحد میں ملاں صاحب مانکی شریف مانے جاتے تھے۔

ہاڈا صاحب کا اصلی نام تو راقم کو معلوم نہیں ہو سکا۔ آپ کا مزار جلال آباد سے جانب جنوب پانچ میل کے قریب واقع ہے۔ جس کا نام ہاڈا شریف ہے۔ غالباً یہاں پر عام طور پر ان بستیوں کے نام پر ہی شخصیتیں شہرت پاتی ہیں۔ جہاں اُن کی پیدائش زندگی کے اشغال یا مزار ہوتے ہیں اسی نسبت سے ہاڈا صاحب کا نام صرف ہاڈا صاحب مشہور ہو گیا۔ جیسا کہ ایک بزرگ آپ کے مریدوں میں سے چار باغ میں گذرے ہیں ان کو میں نے خود دیکھا بھی ہے وہ حضرت صاحب چار باغ کہلاتے تھے۔ اسی طرح میاں صاحب سرکانی ملاں صاحب استاد صاحب ہاڈا شریف۔ ملاں صاحب اکاخیل۔ حاجی صاحب ترنگ زئی اور ملاں صاحب ٹیٹی ملاں صاحب چکنور یہ ہاڈا صاحب کے مشہور مریدوں کے اسمائے مبارک ہیں۔ مجھے ان سب بزرگوں کے خدمت میں حاضر ہو کر نیاز حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ چونکہ خود حضرت ہاڈا صاحب غازی مرد اور کفر دشمن تھے اس لیے ان کے اکثر بلکہ تمام اولوالعزم مرید فرنگی دشمنی (کفر دشمنی) میں پیش پیش تھے۔

ملا صاحب مانکی شریف:-

ان کے برخلاف حضرت ملاں صاحب مانکی شریف چونکہ فرنگی کی رعایا میں رہائش رکھتے تھے۔ ان کی بزرگی اور بڑائی اتنی ہی اچھلی یا اچھالی گئی جتنا انھوں نے اس بزرگ ہستی یعنی ہاڈا صاحب کی توہین کی اتنے ہی بڑے چوٹی کے بزرگ مشہور ہوئے۔ اور یہ دشمنی یہاں تک ترقی کر گئی کہ ہاڈا صاحب نے اگر کسی سنت رسول کو زندہ کیا۔ تو مانکی صاحب نے اس کی مخالفت کی اور میں نے خود ہاڈا صاحب کے اکابر مریدوں کو التحیات میں تشہد کی انگلی اٹھاتے دیکھا ہے۔ اور ان کا یہ قول تھا کہ یہ سنت ہاڈا صاحب نے اس طرح زندہ کی ہے اس کے برخلاف مانکی صاحب کے مرید یہ کہتے سنے ہیں کہ یہ سنت

ہاٹا سنگھ (نعوذ باللہ نقل کفر کفر نہ باشد) کی ہے اس لیے جس کو تشہد کی انگلی اٹھاتے دیکھو اس کی انگلی توڑ ڈالو۔

دشمنانِ اسلام خصوصاً فرنگی کی ان بھونڈی اور ناشائستہ چالوں اور حرکتوں سے نادانستہ یا دانستہ متاثر ہو کر مسلمان اسلام کو کس طرح ذلیل اور خوار کرنے کا موجب بنے ہیں اس کا تذکرہ اپنے مقام پر آئے گا۔

باب دوم
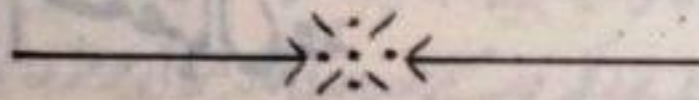
چمرکنڈ میں آمد

ہمارا پُر خلوص استقبال:۔

اگلے دن علی الصبح چمرکنڈ سے گیارہ خچر پانچ چھ بندوق برداروں کے ہمراہ پہنچ گئے اور ہمارا سامان بار کر کے روانہ ہو گئے۔ یہاں سے چڑھائی شروع ہو کر متواتر پانچ میل تک چلی گئی تھی اور درمیان میں گھنے درختوں میں ایک چشمہ ملتا تھا وہاں پر پندرہ سولہ مجاہد ہمارے لیے کھانا لیے ہمارے منتظر تھے۔ جب ہمارے خچر انہوں نے دیکھے تو خوشی کے اظہار کے لیے ہوائی فائر کیے پہاڑوں میں فائر کی آواز گونجی تو ہم نے جو تاثر لیا اس کا اندازہ کچھ وہی ناظرین کر سکیں گے جن کے ذہن میں ہماری تاریخ کا سابقہ پس منظر جاگ رہا تھا۔

چشمے پر بیٹھ کر ہم لوگوں نے کھانا کھایا گندم کی خمیری روٹیاں توے پر پکائی ہوئی اور پشاوری گڑ کے ہمراہ۔ حقیقت ہے کہ تمام عمر گذشتہ اتنا مزہ کبھی کسی چیز میں نہ پایا جو اس اخلاص کی وجہ سے میسر ہوا پھر تازہ دم ہو کر بقایا چڑھائی چڑھی اور تقریباً ڈھائی بجے ہم کنٹا ڈ پر پہنچے، نماز ظہر کا دوگانہ چشمے پر ادا کر لیا گیا تھا۔ عصر سے کچھ پہلے ہم لشکر میں پہنچنے والے تھے، پہاڑ کے سر پر پہنچ کر اور کئی مجاہد مل گئے۔ ہر مجاہد ہمیں بچھڑے ہوئے بھائیوں کی طرح سینہ سے لگاتا بھینچتا اپنی محبت اور مسرت کے پھول نچھاور کرتا

مولانا عبدالکریم صاحبؒ:۔

یہاں بھی تا حدود سے ہماری آمد کی خبر لشکر کر دی گئی۔ پہاڑ پر سے ہماری لشکر گاہ نظر آ رہی تھی۔ ابتدائی آدھے گھنٹے میں ختم ہو نے کو تھی کہ لشکر سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر

اور مجاہد بھی ہمارے استقبال کو بڑھے اور تقریباً پندرہ منٹ وہاں پر معانقے میں صرف ہوئے آگے بڑھے تو لشکر گاہ سے نصف فرلانگ کے فاصلے پر حضرت مولانا عبدالکریم صاحب جس اس وقت تقریباً اسّی برس کے لگ بھگ ہوں گے بقایا مجاہدین کے ہمراہ سامنے پر تشریف فرما تھے یہاں پھر فائروں سے ہمارا استقبال ہوا، ہر مجاہد اور خصوصاً حضرت امیر صاحب نے ہمیں کمال محبت سے نوازا۔ خدا جانے سعد بھائی نے لشکر میں ہمارے حق میں کیا پیغام بھجوائے۔ جو ہم حقیروں کی اتنی خاطر تواضع کی گئی۔ مجاہدین اور امیر صاحب کو دیکھ کر امیر کی پہچان والی خبر کی تصدیق ہو گئی۔ واقعی لباس سب کا ایک تھا کچھ دیر کے بعد عصر کی نماز ہوئی جو خود امیر صاحب نے پڑھائی اس کے بعد ہم چاروں عیالداروں کے لیے رہائش کا انتظام کر دیا گیا۔ اور ہم اپنے اپنے گھروں میں قیام پذیر ہو گئے اور بندوق ساز صاحب کو لشکر گاہ میں علیحدہ جگہ دی گئی۔

لشکر کا تعارف :-

امیرِ لشکر قنوج کے رہنے والے تھے جن کو چالیس برس کی عمر میں ہجرت نصیب ہوئی تھی اور چالیس برس ہجرت کو ہو چکے تھے۔ لشکر میں اکثریت اہل بنگال کی تھی اس کے دوسرے نمبر پر اہل پنجاب کی تعداد چالیس اور پچاس کے درمیان تھی۔ پھر یوپی بہار کے اصحاب کی اور سب سے کم تعداد تناول ضلع ہزارہ کے رہنے والوں کی۔

لشکر میں عام رواج تھا کہ سالار یا امیر لشکر ہندوستان کا جمعدار یا نائب سالار بنگال کا ہوتا اور یہی صورت اس وقت چمرکنڈ میں تھی نائب یعنی جمعدار صاحب بنگال کے تھے جنہیں ایوب بھائی کہہ کر پکارا جاتا تھا اور ہر شخص کسی کو خطاب کرتے وقت نام کے ساتھ بھائی کا لفظ شامل کرتا تھا۔ لشکر میں پہنچ کر میری زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔

آگے چلنے سے پہلے لشکر کے پس منظر سے ناظرین کی آگاہی ضروری خیال کرتے ہوئے جماعت کا مختصر حال پیش خدمت ہے کہ اس تعارف کے بغیر آئندہ بیان ہونے والے واقعات کا فہم آسان نہ ہو گا۔

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک کا موجودہ لشکر ایک شعبہ تھی جو حضرت

سید احمد صاحب رحمت اللہ علیہ بریلوی نے اس وقت شروع کی تھی جب انگریزوں نے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ کو بے اختیار کر دیا تھا اور عملی طور پر خود حکومت کرنی شروع کر دی تھی۔ انگریز قوم کی ایک کمپنی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ماضی میں تجارت کی غرض سے ہندوستان میں داخل ہوئی اور اب سالم ہند کی مالک بن بیٹھی تھی۔ یہ المیہ بالاکوٹ کے میدان میں پیش آیا۔ اس تحریک کا مقصد ہندوستان میں منہاج نبوت کے طرز پر اسلامی حکومت کا قیام تھا۔

تحریک مجاہدین کا پہلا دور :۔

اس تحریک کی ابتداء میں سکھوں سے واسطہ پڑا۔ بعض جزدی کامیابیاں حاصل ہونے کے بعد مفتوحہ علاقوں میں اسلامی نظام رائج کر دیا گیا۔ جسے افغان سردار برداشت نہ کر سکے۔ کیونکہ انہیں سکھوں کے ماتحت بے راہ روی پسند تھی۔ انہوں نے سکھوں سے سازباز کر کے اسلام کے ساتھ غداری کی اس نتیجے میں کثیر مجاہدین و اکابر تحریک شہید ہو گئے۔ اور تحریک اسلامی کا پہلا دور حضرت سید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے جلیل القدر جرنیل حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمت علیہ اور اُن کے کئی قابل رفقا کی شہادت پر ختم ہو گیا۔

اس کے بعد حضرت سید احمد صاحب کے خلفائے العاعظام نے ہندوستان کے مقام پٹنہ سے سرحد پر پہنچ کر نظام کو قائم کیا اور سکھوں پر اتنا دباؤ ڈالا کہ وہ انگریزوں سے مدد کے طالب ہوئے۔ انگریزوں نے اپنی جبلی فریب کاری سے مجاہدین کے عقب پر قابض ہو کر مجاہدین کو گرفتار کر لیا اور سرداران جماعت کو پٹنہ میں نظر بند کر دیا۔ میعاد نظر بندی گزار کر حضرت مولانا ولایت علی صاحب دہلی پہنچے اور بہادر شاہ والی ہند سے جو اس وقت شطرنج بنا کر رکھ دیے گئے تھے ملے۔

تحریک مجاہدین کا دوسرا دور :۔

آئندہ کے لیے تحریک کے ہمہ گیر صورت اختیار کرنے کے متعلق اور ملک کو اغیار کفار کے قبضے سے آزاد کرانے کے واسطے ملک کے اندر اور باہر سے دباؤ ڈالنے کا فیصلہ

کر کے آزاد سرحد پہنچ گئے مگر اکثر مسلمان کہلانے والے رؤسا اور جاگیردار سکھ اور ہندو جو انقلاب میں اپنی موت تصور کرتے تھے انگریزوں کے ساتھ مل گئے اور اس کے نتیجے میں گو سکھوں کی حکومت تو ختم ہو گئی مگر ملک مستقل طور پر فرنگی کے قبضے میں چلا گیا اور آئندہ کیلئے تحریک کو دو نسبتاً کمزور قوتوں کے بجائے ایک مضبوط دشمن سے واسطہ پڑ گیا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد فرنگی نے دوسری چوٹ اس تحریک کو ختم کرنے کی یہ کی کہ ایک طرف ہر اس شخص کو جس پر اسلام پسندی کا شبہ ہوا اسے بغاوت کا الزام لگا کر مقدمات میں جکڑا اور اکثر مقدمہ چلائے بغیر گولیوں کا نشانہ بنا دیے گئے اور کروڑوں اربوں کی جائدادیں ضبط کر لیں اور ملک میں مزید وہشت پھیلانے کے لیے اکابر علماء پر نام نہاد عدالتوں میں بغاوت کا مقدمہ چلایا اور ان کی اکثریت کو پھانسی کی سزائیں دیں۔ دورانِ مقدمہ اس قدر تشدد برتا گیا کہ اکثر مر کر جیئے تاآنکہ جب وہ اپنے ساتھیوں کی سزائیں سن کر ان بزرگوں نے فھوالمراد (یہ تو ہماری مراد ہے) کا نعرہ لگایا اور جب پھانسیوں کی کوٹھڑیاں اُن کے وزن بڑھانے لگیں اور اکثر انگریز مرد اور عورتیں ان کے اوصاف سے آگاہ ہو کر جیل میں ان کی زیارت کرنے جاتے لگے تو یہ جان کر کہ پھانسی کی خوشخبری سے اُن کے وزن بڑھنے لگے ہیں۔ ان کی سزائے موت منسوخ کر کے ان کو کالے پانی بھیج کر اپنی انتقام کی آگ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ اس پاک گروہ کے اولوالعزم اکابر جنہوں نے اصحابہ کرامؓ کا پورا پورا نمونہ عملی صورت میں دکھایا تھا ان کے مقدمے کے مفصل حالات کئی کتابوں میں تفصیل سے ملتے ہیں۔ یہاں اُن کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ جو ناظرین ان مقدمات کا مفصل حال معلوم کرنا چاہیں وہ تواریخ عجیب در منشور اور کالا پانی جیسی کتب ملاحظہ فرمائیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے ان اصحاب کے کردار اور اخلاق کی بلندی اور سیرت کی پاکیزگی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

تحریکِ وہابیت :-

غرض اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے ایک طرف تو تشدد کیا جا رہا تھا اور دوسری طرف پھاڑو اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل پیرا ہو کر اس تحریک کے ڈانڈے تحریکِ وہابیت سے

ملائے جا رہے تھے۔ جس کی حقیقت جاننے کے لیے انگریزی کی ایک کتاب جو مخفیہ طور سے
گورنروں کے درجے کے افسروں کو اپنی اس پالیسی پر عمل پیرا ہونے کے لیے پڑھائی جاتی تھی
جو ۱۹۲۳ء میں وائسرائے ہند کے کتب خانہ سے چوری کرا کر حاصل کی گئی تھی اور مرکز ہم کنندٹ
جمال پاشا ترک کو بطور تحفہ پیش کی گئی تھی جو اس کتاب کے متلاشی تھے۔ اس کے ایک اقتباس کا
ترجمہ کچھ اس طرح تھا۔

انگریزوں کی پالیسی :۔

یہ عجیب بات ہے کہ عبدالوہاب نجدی اس اسلام کو زندہ کرنے کی کوشش میں معروف
تھا جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں غالب دین کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر ہم اس
وقت ترکی اور مصر کو ان کی ملوکیت کے خطرے سے ڈرا کر اس تحریک کو ختم نہ کرا دیتے تو یقیناً
یہ تحریک غالب آکر دنیا کے نقشے کو بدل ڈالتی جو کمی حضرت عمرؓ کی عمر وفا نہ کرنے کے باعث
ساری دنیا کے اسلام کے زیرنگین آنے میں رہ گئی تھی وہ پوری ہو جاتی مگر ہم نے کمال دانائی سے
کام لے کر خود پیچھے رہ کر ترکی اور مصر سے کام کیا اور ان دونوں مملکتوں نے نادانستہ
ہمارا کام انجام دیا اور خود اپنی یعنی اسلام کی ترقی کا راستہ بند کر دیا۔ اور اگر ہم نادانی
کر کے خود حملہ آور ہوتے تو کفر اور اسلام کا سوال پیدا ہو کر ساری دنیا اسلام کے اتحاد کی
شکل اختیار کر لیتی اور واقعی دنیا کا نقشہ تبدیل ہو کر رہتا ہماری تدبیر یہی تھی کہ ہم حملہ آور نہ ہوں
بلکہ مسلمانوں میں آپس میں جنگ ہو۔ یزید اور حضرت امام حسین کے واقعہ سے اور دوسرے
حضرت علیؓ اور معاویہ کی جنگ کے وقت رومی سلطنت کے اس ارادے کا علم کہ اس وقت
مسلمان آپس میں مصروف ہیں (ہم بڑھ کر دمشق پر قبضہ کر لیں) کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ
نے فرمایا تھا کہ اگر دمشق پر حملہ کیا گیا تو معاویہؓ کی طرف سے سب سے پہلا سپاہی جو میدان
جنگ میں دیکھا جائے گا وہ حضرت علیؓ ہوں گے۔ ان دو واقعات کے علم نے
ہمیں مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کی طرف رجوع
کیا۔

مذہبی تفرقہ پروری :۔

چنانچہ اس تحریک کو ناکام کرنے کے لیے بھی اس تجربہ سے فائدہ اٹھانے کا رحجان برطانیہ میں پیدا ہوا۔ اور ایسا کرنے میں انگریزوں کو خاص پریشانی اور تکلیف بھی نہ اٹھانی پڑی۔ بلکہ دہشت زدہ غلام قوم سے نہایت حقیر معاوضے پر ایک عظیم گروہ برطانیہ کے ہاتھ لگ گیا جس نے برطانیہ کے اندازے سے بھی زیادہ کام کیا اور حنفی وصابی کا سوال یہاں تک چمکا کہ ایک ملا جس کے پاؤں پر خدا کے راستے پر خاک کی دھول بھی نہ پڑی تھی۔ منبر رسول پر کھڑا ہو کر بے محابا کہہ اٹھتا کہ اگر مسلمانوں کی حد میں کتا داخل ہو جائے تو فرش ناپاک ہو سکتا ہے گر بے ادب وصابی (ایک پاک مجاہد سے مراد) اگر مسجد میں آجائے تو فرش دھونے سے پاک نہیں ہو سکتا۔ بلکہ فرش کو اکھاڑ پھینکنا چاہیے اسکے ساتھ ہی خود مقتدین میں ایک نیا شوشہ چھوڑا گیا۔ چند دہشت زدہ لوگوں کو ورغلایا گیا کہ وہ فرنگی کی نام نہاد عدالت میں یہ دعویٰ دائر کریں کہ وصابی ایک گالی ہے جو شخص کسی کو وصابی کہے اس کے برخلاف مقدمہ دائر کیا جاسکے اور پھر اس مقدمہ کو اتنا اچھالا گیا کہ یہ لندن کی پارلیمنٹ تک جا کر فیصلہ ہوا کہ ہر شخص جو کسی کو وصابی کہے گا اُسے چھ ماہ کی سزا دی جائے۔

انگریزوں کے لیے خطرہ :۔

مگر ان تمام حربوں اور تشدد کے باوجود سلطنت برطانیہ اس پاک تحریک کو ختم نہ کر سکی اور وقتاً فوقتاً اس تحریک نے برطانیہ کو ہر ممکن جرکا لگایا۔ حتیٰ کہ انگریزوں نے اس تحریک کو ایسی دبی چنگاری سے تشبیہ دی کہ اگر اس تحریک کو ایک جگہ سے مفقود کرنے کی کوشش کی جاتی تو یہ دوسری جگہ آگ لگا دینے کا موجب بنتی اس طرح لڑتے بھڑتے یہ تحریک پہلی جنگ عظیم کے وقت ایک ناقابل نظر انداز خطرے کی شکل میں موجود تھی اور اس خطرے کو دیکھتے ہوئے ایک مسلمان ڈپٹی برکت علی کو فرضی مفرور بنا کر لشکر کے مرکز کی سمت میں بھیجا گیا۔ جہاں پر اس وقت مولانا نعمت اللہ صاحب امیر لشکر تھے۔

انگریزوں سے صلح کی کوشش :۔

اتفاق سے ان دنوں ایک اور بہت مشہور لیڈر جو اس تحریر کے وقت بقید حیات ہیں (ان کا اسم گرامی ظاہر کرنے کی ضرورت یا مصلحت نہیں سمجھتا) بھی اسمت میں آئے ہوئے تھے۔ ان کے اجتہاد میں اپنے داخلہ ہند کی اجازت کے لیے بھی اور ڈپٹی صاحب موصوف کی رہائی کی خاطر بھی یہی مناسب جانا گیا کہ نعمت اللہ صاحب انگریزوں سے صلح کر لیں۔ چنانچہ اسی شرط پر ہر دو اصحاب داخلہ ہند کے لیے آزاد ہو گئے۔ مگر جماعت مجاہدین میں ایک فتنہ عظیم کا دروازہ کھل گیا کیونکہ نعمت اللہ صاحب نے یہ شرط قبول کر لی تھی کہ آئندہ مجاہدین جہاد کی تبلیغ سے دستکش ہو جائیں گے البتہ اگر قبائل خود بخود انگریزوں سے ٹکر لیں گے تو اس علاقہ کے رواج کے مطابق مجاہدین شرکت کر سکیں گے اور یہ مجبوری شرکت اس معاہدہ پر اثر انداز نہیں ہو گی۔

جاسوسوں کی آمد و رفت :۔

اگرچہ آخری شرط کے ذریعہ جماعت پر جہاد کا راستہ کھلا رہ گیا تھا۔ مگر یہ ایک فطری امر ہے اور عام قاعدہ کہ دو معاہد گروہوں میں جب کہ ایک طاقتور اور دوسرا کمزور ہو تو کمزور ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے۔ اور طاقتور ہر طرح نفع حاصل کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجاہدین کے قاصدوں اور ڈاک کو اندرون ملک میں اگر کچھ آزادی حاصل ہو گئی تو دوسری طرف برطانوی نمائندوں (جاسوسوں) کی آمد و رفت اتنی بڑھ گئی کہ لشکر کی چھوٹی بڑی خبر کا راز چھپانا مشکل ہو گیا بلکہ اس طرح اندرون ملک کے انصار کو اور بھی خطرہ پیدا ہو گیا اور نتیجہ یہ سامنے آگیا کہ اگر اور تھوڑی مدت بھی یہ معاہدہ قائم رہا تو اندرون ملک کے تمام انصار جو دشمن کے قبضے میں تو پہلے سے موجود ہیں ایک دم گرفتار ہو کر تحریک کے خاتمہ کا موجب ہوں گے۔

چمرکنڈ کی چھاؤنی :۔

چنانچہ جماعت کے اندر ایک مقتدر طبقہ کسی قیمت پر اپنے راز سے دشمن کی آگاہی

کو نہایت خطرناک تصور کرتا تھا اور وہ فرنگی کے آدمیوں کی آمدورفت کا سخت مخالف تھا۔ کیونکہ کلمہ گو منافق علانیہ کافر سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں اسی وجہ سے جماعت میں اختلاف شروع ہوا اور بالآخر تقریباً ڈیڑھ سو مجاہد حضرت مولانا عبدالکریم قنوجی کی سرکردگی میں چمرکنڈ ایک وقت مقام جو حضرت ہادی صاحب کی وفات کے بعد خالی پڑا تھا۔ حاصل ہوگیا یہ مقام بالائی مہمند اور باجوڑ کے اتصال پر اور افغانستان کی سرحد سے صرف ایک میل اور سرکانی ایک افغانستان کی آخری سرحدی چھاؤنی اور مرکز میاں صاحب سرکانی سے صرف چھ میل پر واقع ہے اس موقعہ پر مولانا نعمت اللہ صاحب نے یہ مشہور کر دیا کہ یہ لوگ باغی ہو کر شروع کر گئے ہیں۔ اور در پردہ چمرکنڈ کی امداد بھی کرتے رہے گویا کہ ایک حیلہ کہ کے معاہدہ بھی قائم رکھا اور جہاد کو بھی نقصان نہ پہنچنے دیا۔ غالباً یہ اقدام ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۸ء کے مابین عمل میں آیا۔ اس مقام پر شروع اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ہمارا قافلہ کابل سے یہاں پہنچا۔ کابل سے واپسی پر جلال آباد میں جن لوگوں کا غائبانہ تعارف مولوی یونس صاحب نے مجھے کرایا تھا وہ لوگ اسی رنگ میں رنگے ہوئے دیکھے گئے۔ حضرت مولانا عبدالکریم صاحب جو اس وقت تقریباً اسی برس کے پیٹے میں ہوں گے۔ امیر لشکر تھے یہاں پر ہر ادنےٰ و اعلیٰ صبغۃ اللہ میں ڈوبا ہوا پایا گیا۔ اس تحریک کے بانیوں اور ان کے خلفاء رحمہ اللہ علیہم اجمعین کی سیرت کا اندازہ ناظرین خود فرمائیں جب کہ تقریباً نوے سال بعد کے لوگ اتنے بلند اخلاق تھے کہ جماعت کے باہر اتنے بلند اخلاق انسان کا ملنا مشکل بالکل ناممکنات سے تھا۔ جی چاہتا ہے کہ جماعت کے چند اصحاب کا مختصر تعارف ناظرین کو کرا دوں تاکہ ناظرین خود جماعت کے افراد سے ان کے کردار اور سیرت اور اخلاص سے واقف ہو جائیں۔

امیرِ لشکر کا تعارف:۔

حضرت مولانا عبدالکریم صاحبؒ نے ۱۸۸۰ء میں چالیس برس کی عمر میں ہجرت کی گذشتہ چالیس برس ہجرت کے دوران وطن قنوج میں گئے کہ اگر اندرون ہند وفات ہو گئی تو آخرت خراب نہ ہو جائے۔ ستائیس چھوٹی، بڑی لڑائیوں میں شرکت کر چکے تھے اور

اس عزم میں ابھی جوان تھے۔ کھدر پہنتے اور کپڑا سینے کے لیے گولی کا نہ لایتی دھاگہ جان کر استعمال نہ کرتے۔ بلکہ کپڑے میں سے دھاگے نکال کر بٹ دے لیتے اور اپنے ہاتھ سے سی لیتے۔ پگڑی بھی کھدر کی پہنتے۔ نہایت سادگی پسند لشکر کے بعض بھائی جو خود سلائی نہ جانتے اُن کی سلائی بھی اکثر آپ ہی کر دیتے اور ان کے پھٹے، پرانے کپڑے مرمت بھی کر دیتے۔ آپ کی مساوات پسندی کا یہ عالم تھا کہ لشکر میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کو کمتری کا احساس ہو۔ لشکر کی عام خوراک پر قناعت کرتے اکثر دیکھا گیا کہ عصر کی نماز کے بعد صبح کی کمی کی روٹی، باریک نمک روٹی پر بکھیرا اور پر پانی کا چھینٹا دے کر کھا لیتے اور بس یہی شام کا کھانا ہو جاتا۔ نماز اور عبادت سے سیر نہ ہونے والے رمضان شریف میں ساری رات قیام کرتے نہ تھکتے تھے چمرکنڈ میں عام طور پر دو قرآن ختم ہوتے تھے۔ ایک حافظ بارہ تراویح پڑھاتے اور دوسرے حافظ آٹھ تراویح پڑھاتے۔ اتنے میں بارہ بج جاتے کیونکہ نہایت اطمینان سے نماز ادا کی جاتی تھی۔ اس کے بعد ایک تازہ دم حافظ جو عشا کے فرض و سنت ادا کر کے سوئے رہے ہوتے تھے رات کے پچھلے حصے میں تراویح ادا کرنے کی سنت پر عمل کرتے۔ چنانچہ امیر لشکر ان کے ساتھ شریک ہو کر فرائض امارت گیارہ، بارہ بجے تک بجا لاتے اور اس کے بعد ایک یا دو گھنٹے آرام فرما کر ظہر ادا کر کے تلاوت قرآن میں مصروف ہو جاتے یا فرائض نپچے ہوئے کام دیکھتے۔ ڈاک وغیرہ دیکھتے اور عصر کے بعد دعا اور تلاوت میں افطاری تک مشغول رہتے۔ اسی برس کے جوان ضعیف العمر۔ لیکن جوانوں سے زیادہ چست۔

ایک کرامت :۔

غالباً ۱۹۲۲ء میں ایک دن علی الصبح چند قبائلی سردار آپ کے پاس آئے اور کہا امیر صاحب اب تو ہم لوگ جوار کے پتے پیس کر کھا چکے اب تو بارش کی دعا کریں۔ آپ نے معاً لشکر میں حکم دیا کہ جن لوگوں کے وضو نہیں وضو کر کے آجائیں۔ تقریباً آٹھ بجے کا وقت ہوگا آسمان بالکل صاف تھا کہ لشکر گاہ سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر اپنے گھوڑے خچرے کر لشکر نماز کے لیے جمع ہو گیا۔ آپ نے دو نفل نماز با جماعت پڑھائی جس کے امام وہ خود ہی تھے

اور بعد نماز دُعا مسنونہ مخصوص جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے۔ نہایت خشوع اور خضوع سے مانگی مقتدی امین کہتے تھے۔ دوران دعا بادل آ گئے اور بوندا باندی شروع ہو گئی۔ حتیٰ کہ لشکر گاہ تک پہنچتے پہنچتے لشکر خوب بھیگ گیا۔ یہ واقعہ میرا چشم دید ہے۔

دوسری کرامت:۔

آپ اکیلے موری خانہ میں آرام فرماتے تھے۔ سردیوں میں کمرے کو گرم رکھے بغیر انسان سو نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ آپ کے بیٹھنے کی جگہ سے مغرب کی جانب آگ جلانے کی جگہ تھی جو تقریباً تین فٹ مربع ہوگی۔ آگ کی جگہ کے جانب شمال آپ کا نماز کا مصلیٰ ہوتا تھا۔ آگ دروازہ کے سامنے جلتی تھی۔ داخلے کے بعد جانب راست بیٹھنے کی جگہ اس کے بالکل ساتھ آپ کی چارپائی ہوتی تھی۔ چارپائی بیٹھک کے اتنی قریب ہوتی تھی کہ چارپائی کی پٹی ہی آپ کے تکیے کا کام دیتی تھی۔ چارپائی کے نیچے سب سے پہلے خطرناک بموں کی پیٹیاں اور کارتوس کی پیٹیاں ہوتی تھیں جو پچھلے کمرے کی آخری حد دیوار تک پھیلی ہوتی تھیں اور چارپائی کے سرہانے روپے کے صندوق رکھے ہوتے تھے۔ کمرہ کافی کھلا تھا۔ روپیہ ایمونیشن (گولہ بارود) کمرہ کے مشرقی جانب بیٹھک کے بالکل قریب پیچھے اور بجانب مغرب غلے کے خندار چٹائیوں کے بند بنا کر مختلف اقسام کے الگ الگ بنائے گئے تھے۔ جب آپ اصلاح کی غرض سے (اس سمت روانہ ہوئے (جس کے بعد آپ چمرکنڈ نہ آ سکے بلکہ چمرکنڈ سے روانگی کے دو ماہ بعد اس سمت میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے) تو مولوی فضل الٰہی - وزیر آبادی نے جو ان کے جانشین بنے تھے سب سے پہلے ان بکسوں کو، جو گولہ بارود سے پر تھے موری خانہ سے اٹھا کر ایک محفوظ مقام پر رکھوائے کہ آگ روکنے والا اٹھ گیا ہے۔

مولانا یوسفؒ بڑائے:۔

ان کے حسب و نسب سے تو واقفیت نہ ہو سکی۔ لاہور کے رہنے والے کسی اچھے

خاندان سے متعلق تھے۔ ان کے والد برطانیہ کے بہت اعتباری اور کسی بلند منصب پر فائز رہ چکے
تھے اور ان کے کوئی بھائی بیرسٹر اور دوسرے بڑے سرکاری عہدوں پر مامور تھے۔ آپ ان
پندرہ کالجیٹس میں سے تھے جو ۱۹۱۵ء جنوری میں گورنمنٹ کالج لاہور سے آزادی ہند کے
مقصد کو لے کر نکلے اور باقی ساتھیوں کو چھوڑ کر جو کابل میں مختلف سرکاری اور غیر سرکاری اداروں
میں عیش کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ لشکر میں نہایت سادہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ کھدر میں
ملبوس رہ کر نہایت سادہ غذا پر نہایت جانفشانی سے فرائض منصبی ادا کرتے تھے۔ حضرت
مولانا عبدالکریم کی موجودگی میں ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ان کا ایک قول
جو وہ اکثر دہراتے تھے۔ سادہ غذا جس میں گھی نہ ہو جسم کے عناصر کو بہت تقویت بخشتی ہے
اور گھی کی ثقیل غذائیں تقویت کی بجائے کئی بیماریوں کا باعث ہوتی ہیں اور وہ مسئلہ کاٹ
کے قائل تھے۔ عام طور پر لشکر کو قواعد پریڈ اور نشانہ بازی بھی سکھاتے تھے وہ ایک
بہت ماہر قواعد دان تھے۔ قواعد کی زبان عربی تھی اور نشان کے نہایت آسان طریقے انہوں
نے ایجاد کر رکھے تھے۔ اتنے لائق ہونے کے باوجود اس قدر ایثار اور مساوات کے
نمونے کہاں اور کب میسر آتے ہیں، اس پاک تحریک کا فیض کس فراوانی سے میسر ہو رہا تھا
ان کی انگلش بہت اچھی تھی جب کبھی گورا فوج میں ان کے لکھے ہوئے ہینڈ بل پہنچائے
جاتے فوج میں بددلی کا باعث ہوتے۔ جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔ امیر لعنت اللہ کو قتل
کرنے کے نتیجے میں قتل کیے گئے اپنے خیال کے مطابق جماعت کو فتنہ سے محفوظ کرنے کی
خاطر اپنی قربانی پیش کی۔

مولوی یاسین صاحب بی۔ اے آنرز ۲۸

عمر بیس اکیس سال کی ہوگی بھرے جسم کے نوجوان قصور کے شیخ خاندان سے تعلق رکھتے
تھے۔ ہجرت سنہ ۱۹۲۰ء میں کابل سے لوٹے تھے۔ ان کے عزیز رشتہ دار بھی بڑے دولتمند
اور بڑے بڑے عہدوں پر مامور تھے مگر یہ مجسمہ اخلاص تحریک کے سارے لوازم مساوات
بوجھ اٹھانا، پہرہ دینا تک خوشی خوشی انجام دیتے تھے۔ حالانکہ ان کے فرائض ناظم شعبہ تبلیغ

ہی کی حیثیت میں تھے۔ اپنے فرائض کے علاوہ ہر کام میں شمولیت کے ساتھ ساتھ شب بیداری اور مزید تعلیم مذہبی کی طرف بہت رغبت اور شوق رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک قلیل مدت میں قرآن مجید کے پندرہ پارے حفظ کر لیے تھے۔ دینداری یا تقویٰ کی یہ نوبت تھی کہ ہر تیسرے دن وصیت لکھ کر بکس میں رکھ دیتے تھے۔ بڑے گھر سے آئے تھے ان کا وہ لباس ہی جو وہ گھر سے لائے تھے کئی سو کا ہوگا میں ان کے شعبہ میں پریس کا مہتمم تھا اپنے شعبہ میں میں ان کا ماتحت تھا۔ میرے ساتھ ان کا سلوک ایک واقعہ سے ظاہر ہے وہ کسی سلسلہ میں کابل گئے اور وہاں ان کو سفارت کے فرائض بھی ادا کرتے پڑ گئے۔ جاتے وقت اپنے بکس کی چابی مجھے دے گئے۔ بکس دفتر میں تھا مجھے ایک رقعہ لکھا کہ میرے بکس میں سے میرے سرٹیفکیٹ جن میں جمال پاشا کا بھی ایک سرٹیفکیٹ جو دوران سفر کابل کچھ دن پاشائے موصوف کے سکریٹری کے فرائض انجام دینے کی حیثیت میں حاصل ہوا تھا اُن کو کابل میں بھیج دوں اور ایک اور بات کہ تم نے بتا رکھا ہے کہ تمہیں کچھ مالی امداد کی ضرورت ہے۔ جو تم کسی حالت میں لشکر سے نہیں لینا چاہتے اس لیے میرا یونیورسٹی والا سیاہ گاؤن بیچ کر روپے استعمال کر لو میں یہ پیش کش قبول کرنے کی جراءت تو نہ کر سکا مگر سرٹیفکیٹ نکالنے کے لیے جب میں نے بکس کھولا تو سب اشیاء کے اوپر ایک رقعہ تھا جس پر وصیت کا لفظ لکھا تھا۔ اس میں کورٹ کے علاوہ کچھ اور اشیاء بھی میرے نام تھیں اور بعض دوسری اشیاء کئی افراد مختلف کے نام لکھ رکھی تھیں۔ چند کپڑے اٹھانے کے بعد پھر ایک وصیت نکلی جو اس سے پہلے لکھی ہوئی تھی۔ اس میں کئی طرح کی وصیتیں نکلیں بعض اشیاء بیت المال کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ میں نے سرٹیفکیٹ بھیج دیے۔ جب کابل سے واپس لوٹے تو کوٹ کے متعلق معلوم کر کے کچھ ناراض سے ہوئے۔ میں نے اپنی معذوری ظاہر کر دی تب کہیں برابر ہوئے۔

فرانس کے لیے روانگی :۔

جب حکومت ہی طرف سے انہیں فرانس بھیجے جانے کی ضرورت ہوئی تو ان کے

والد کو بھی علم ہو گیا وہ بڑے آدمی تھے پشاور آ کر چیف کمشنر سر ہملٹن گرانٹ کو ملے اور اس
سے اجازت چاہی کہ ان کے صاحبزادے کو براستہ ہند یورپ جانے دیا جائے
اس نے کہا کہ آپ اسے بالو پیپر ہماری مرضی میں ہو گا ہم چاہیں گے تو اسے پاسپورٹ
دیں گے۔ یہ انہیں منظور نہ ہوا تو چیف کمشنر نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ دیا کہ آپ کا لڑکا
جدھر جائے گا اور جہاں سے گزرے گا اس کا واسطہ ہمارے آدمیوں سے ضرور پڑے
گا۔ وہ ہم سے بچ نہیں سکے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ یاسین صاحب کے خطوط جو فرانس سے
آئے تو انہوں نے چیف کمشنر کے قول کی تصدیق کر دی کہ میں انگریز لڑکوں میں گھرا
ہوا ہوں اور خطرے سے دو چار ہونا یقینی ہے (اسلام کے خلاف انگریزوں
اور فرانس میں باہمی رابطہ کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ کچھ دن
بعد دریا میں غرق کر دیے گئے اور خودکشی ان کے ذمہ لگا کر مواخذہ سے
بچ گئے۔

روانگی کا منظر :۔

لشکر سے ان کی یورپ کو روانگی کا ایک عجیب منظر تھا۔ سب بھائی گلے مل مل
کر رخصت کر رہے تھے اُن کو ایک خدمت کے اہل پا کر ان کی عزت افزائی کی
خوشی اور جدائی کا رنج ملے جلے جذبات تھے جو ہر بھائی کے چہرے پر عیاں تھے
مجھے ان کو رخصت کرنے کے لیے جلال آباد تک پہنچانے کی خدمت سپرد ہوئی تھی
جلال آباد سے رخصتی کے وقت مجھے ایک رخصتی فرمائش کی گئی۔ بھائی عبدالکریم
دو نفلوں میں سورۂ بقر سنا دو۔ دن کے قریباً آٹھ بجے تھے فرمائش پوری
کر کے تیاری شروع ہو گئی۔ اب میرا چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ کسی طرح
جدائی سے پہلے کی گھڑیاں طویل ہو جائیں۔ مگر!... وقت کب کسی کا لحاظ رکھتا
ہے۔ آخر تانگہ روانہ ہو گیا۔ اور میں تانگہ چھوڑتے چھوڑتے جلال آباد سے سلطانپور
جلال آباد سے ایک پڑاؤ تک جا پہنچا وہاں سے روتے ہوئے واپس لوٹا۔ اور ان

کا یہ خطرہ (کہ سورہ بقر سنا دو پھر کیا معلوم ملاقات ہو سکے یا نہ) پورا ہو گیا اور وہ پھر نہ لوٹ سکے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

ع خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

باب سوم
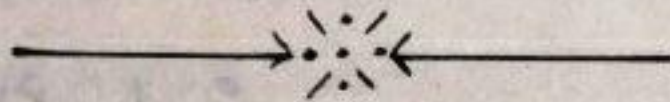
مولانا بشیر رحمۃ اللہ علیہ شہید

حضرت مولانا بشیر صاحبؒ :-

اپنے وقت میں تحریک کے روح جماعت کی جان خود مجسم تحریک۔ فدائی جماعت۔ فنا فی اللہ بشیر کابل میں چند منٹ ان کی گفتگو سننے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ہمیں چمرکنڈ کی طرف رخصت کر کے چند دن کے بعد ان کو وزیرستان میں جہاد کے انتظام کی خاطر جانا پڑا۔ جہاں سے وہ دو سال بعد لوٹے۔ ان کا حال بیان کیا لکھوں۔ ناظرین خود ملاحظہ فرمائیں گے کہ ساری سرگذشت بشیرؒ کے گرد گھوم رہی ہوگی واقعی وہ تحریک کی جان تھے اور حقیقتاً ان کی شہادت کے بعد تحریک ایک بے جان لاشہ رہ گئی۔ جس طرح تحریک کے ہر اول میں حضرت مولانا اسمٰعیل شہید تحریک کی جان دکھائی دیتے ہیں اسی طرح تحریک کے بے جان ہونے سے پہلے بشیر تحریک کی جان تھے اور ان کی شہادت سے تحریک بے جان ہو کر رہ گئی بشیرؒ صحابہ کرامؓ کی ایک ایسی کاپی کا عملی نمونہ تھا جس میں صحابہ کرامؓ کے کارناموں کی جھلک کا رنگ مختلف خاکوں کی شکل میں مختلف رنگوں کے ساتھ نمایاں تھا۔ صحابہ کے اتباع کا اصلی اور عملی نمونہ سفر اور حضر میں اپنی جان کی حفاظت کا خیال کم اور ساتھیوں کی جان کی حفاظت کا خیال زیادہ رکھتے تھے۔ آپ حضرت مولانا رحیم بخش صاحب امام مسجد جامع چنیانوالی کے بڑے صاحبزادے تھے۔ اتباع سنت کو ورثہ ہی میں پایا تھا۔ اسلامی تاریخ کے عمیق مطالعہ سے صحابہ کرامؓ مجاہدین اسلاف کا رنگ خوب چڑھا تھا متاخرین ائمہ میں حضرت امام ابن تیمیہؒ اور حضرت مولانا اسمٰعیل شہید کا مسلک بہت مرغوب رکھتے لشکر میں قرآن مجید کا درس دیتے تو اکثر سامعین صحابہ کرام کا یہ قول بے اختیار دہراتے رضینا باللہ ربا و بالاسلام دینا و بمحمد نبیا صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم۔ آپ کے درس کی تاثیر سے عمل کا ولولہ پیدا ہوتا تھا۔ ۱۹۱۵ء ۱۰ جنوری میں گورنمنٹ کالج چھوڑ کر جو پندرہ کالجیٹ سرحد پار کرکے اسمست بس آزاد علاقہ مرکز جماعت میں آئے تھے وہ آپ کے درس سے متاثر ہوئے اور خدمت اسلام کی خاطر اپنا مستقبل قربان کر دیا۔ اس اخراج کے بعد آپ بھی مرکز جماعت میں پہنچ گئے۔ آپ کے لشکر میں پہنچنے سے پہلے طلبہ کا ٹولہ بمیت مولانا عبید اللہ سندھی کابل جا چکے تھے۔ مولانا سندھی صاحب نے لشکر سے مطالبہ کیا کہ میں جماعت میں اس شرط پر قیام پذیر ہو سکتا ہوں کہ مجھے لشکر کا امیر مانا جائے اور لشکر والوں نے اس حدیث کی روشنی میں کہ (جو شخص عہدہ کا طالب ہو اس کو ہرگز عہدہ نہ دیا جائے) انہیں امیر تسلیم نہ کیا بلکہ کہا کہ آپ لشکر میں قیام کریں۔ ممکن ہے کہ لشکر آپ کی قابلیت سے متاثر ہو کر آپ کو امیر مان لے۔ مگر آپ نہ ملنے اور طلبا جو ان کے زیر اثر آگئے تھے ان کو ساتھ لے کر کابل پہنچے۔

نوٹ :۔ اپنے والد کی وفات کے بعد آپ نے اپنے والد کی بجائے مسجد چنیاں والی میں درس جاری کیا تھا اور گرہ یجویٹ معززین اس میں شامل ہوتے تھے۔

کالجئیٹ مجاہدوں کی رہائی :۔

امیر حبیب اللہ انگریزوں کے زیر اثر تھے اس لیے انگریزوں کے ایما سے یہ لوگ جیل بھیج دیے گئے۔ پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء سے شروع ہو چکی تھی اس لیے امید غالب تھی کہ یہ لوگ تا اختتام جنگ جیل بند رکھے جائیں مگر جب بشیر صاحب لشکر میں وارد ہوئے اور ان کو کوالف سے آگاہی ہوئی تو انہیں صدمہ ہوا اور ارادہ کیا کہ اگر وہ کابل جا سکیں تو کچھ چارہ جوئی کریں۔ اُن کی یہ خواہش جلد ہی خدا نے پوری کر دی اور آپ کو جماعت کی طرف سے فرائض نمائندگی جماعت (سفارت) کے لیے امیر لشکر مولانا عبدالکریم صاحب نے مامور فرمایا اور آپ نے کابل پہنچ کر عین السلطنت سردار نصراللہ خان (جو امیر کابل کے چھوٹے بھائی تھے) سے مل کر ان سب کو زندان سے رہائی دلائی۔ سردار نصراللہ خان پہلی ہی ملاقات میں مولانا بشیر صاحب کے گرویدہ ہو چکے تھے بلکہ انہوں نے امیر حبیب اللہ

کو مجبور کرکے ان لوگوں کو رہا کرایا تھا۔ اسی وقت سے امیر حبانگر یزوں سے بہت متاثر تھا جناب بشیر صاحب سے کبیدہ خاطر ہو گیا وہ جان گیا تھا کہ سردار موصوف کو مولانا نے اتنا تاثر ڈالا ہے کہ وہ امیر کی کسی مصلحت کی پرواہ نہیں کرتا۔ امیر کے اس تکدر اور نفرت کا خاتمہ اس وقت ہوا جب امیر حبیب اللہ ۱۹۱۹ء میں قتل کر دیے گئے۔ تفصیل اپنے موقعہ پر بیان ہوگی مولانا کی سیرت کا کچھ ذکر تھا اب اس کی طرف لوٹنا چاہیے یہاں آنا جاننا ضروری ہے کہ مولانا خود حامل شریعت ہونے کے باعث صاحب تاثیر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میری یہ حالت تھی کہ مولانا سے علیحدگی مجھے سخت ناگوار تھی اور مولانا کے کلام سے بہرہ اندوز ہوتے رہنے کو ایک نعمت عظمے تصور کرتا۔ ان کا کلام میرے درد دل کی دوا تھا۔ ؎

میرے درد دل کی دوا یہی
نہ کہا کرے میں سنا کروں

مولانا بشیرؒ کے خلاف سازش :-

مولانا کی دشمنی صرف کفر سے تھی۔ مسلمان اگر ان کے قتل کا ارادہ بھی کرتا وہ اسے معذور جانتے ہوئے چشم پوشی فرماتے۔ ایک واقعہ میرے سامنے ایسا بھی گزرا۔ ۱۹۲۲ء کے رمضان شریف میں ۲۳ تیسواں روزہ تھا ہم لوگ دیگر کی نماز سے فارغ ہوئے تھے اور ابھی مولانا فضل الٰہی صاحب اور مولانا بشیر صاحب (جو مسجد کے دو مشرقی اور مغربی کردں میں علی الترتیب اعتکاف پذیر تھے) ابھی اندر ہی گئے تھے کہ نادر شاہ جو عام طور پر لشکر کے سپہ سالار کے فرائض انجام دیتے تھے مگر شادی کرنے کے بعد کنڈ چرس جو چمر کنڈ سے ایک دن کی منزل پر حدود افغانستان میں دریائے کنڈ کے کنارے آباد ہے تھے مسجد میں آئے اور دونوں صاحبان کو درون مسجد لے گئے اور اندر جاکر ایک سوال کیا کہ ایسے شخص کے بارے میں کیا فتویٰ ہے ایک بے گناہ مسلمان کو بغیر حق کے قتل کرنے کا اقدام کرنے کے لیے ایک لمبی منزل طے کرے اور صرف موقعہ کا منتظر ہو۔ اتنا سنتے ہی مولانا فضل الٰہی صاحب نے قتل الموذی قبل الا یذاء موذی کو ایذا دینے

سے پہلے قتل کردو کا مقولہ دہرایا۔ مگر مولانا بشیر نے فرمایا۔ کہ بھائی میرے سامنے حضرت علیؓ کی مثال روشن موجود ہے آپ نے لوگوں کے اس مشورہ پر فرمایا تھا کہ عبدالرحمان بن ملجم ملعون کو کیوں گرفتار نہ کر لیا جائے۔ فرمایا تھا کیا میں ایسے شخص کو گرفتار کر لوں جس نے ابھی جرم کیا ہی نہیں۔ یہ سن کر شاہ صاحب نے بتایا کہ کابل سے فلاں فلاں صاحب نے فلاں شخص کو ساڑھے چار ہزار روپیہ پیشگی اور ساڑھے سات ہزار قتل کے بعد کے وعدہ پر آپ کے قتل کے لیے بھیجا ہے اور خوش قسمتی سے اس نے مجھے اپنے معاون کی حیثیت سے شمولیت کی دعوت دی اور اس خیال سے کہ اگر میں نے یہ دعوت قبول نہ کی تو ممکن ہے یہ کسی دوسرے کی اعانت حاصل کر کے یا کسی طرح اکیلا ہی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے اس کو دھوکہ دینے کا فیصلہ کر لیا اور اس کے ساتھ یہاں آیا ہوں اور وہ یہاں قریب ہی فلاں مقام پتھروں کی آڑ میں بیٹھا ہے اور میں اس کو یہ کہہ کر آیا ہوں کہ میں موقعہ دیکھ آؤں تاکہ ہم رات کے چھپتے میں اپنا کام پورا کر سکیں۔ اب میرا ارادہ اس کو قتل کر دینے کا ہے تاکہ خطرہ ٹل جائے۔ مولانا نے اس سے منع کیا۔ مگر شاہ صاحب کا اجتہاد یہی تھا کہ اگر اس کو چھوڑ دیا گیا تو خطرہ کا باعث ہوگا چنانچہ انہوں نے مولانا فضل الٰہی صاحب کے فتوائے کو ترجیح دی اور واپس جا کر اس کو یہ کہہ کر تلوار مار دی کہ اس سے پہلے کہ تم بشیر کو قتل کرو میں تمہیں واصل جہنم کرتا ہوں اس سے پہلے رمضان میں وزیرستان میں ان کے قتل کی ایک فرنگی سازش ناکام ہو چکی تھی۔

کابل سے جلاوطنی کی خبر:۔

اس واقعہ کو ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ ایک دن دوپہر کے بعد کابل کی ڈاک جب میں نے دیکھی تو کابل کے اخبار میں ایک خبر تھی کہ فلاں پارٹی پر کمیونسٹ پراپیگنڈا کرتے اور روس سے روپیہ لے کر عیاشانہ زندگی بسر کرنے کے الزام ثابت ہو کر اس پارٹی کو فلاں تاریخ کو ملک بدر کرنے کے احکام صادر ہو چکے ہیں پارٹی مذکور فلاں تاریخ کو کابل سے ماسکو کے لیے روانہ ہو گی۔ اور پہلی منزل جبل السراج میں کرے گی میں نے ایک اہم خبر کے خیال سے اخبار مولانا کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مولانا خبر پڑھتے ہی تیار ہو گئے اور گھوڑے

پرنزین کسنے کا حکم دے دیا گیا۔ وقت تنگ تھا۔ روانگی میں صرف چار دن باقی تھے مگر مولانا نے تو پاسپورٹ بھی نہیں بنوایا تھا۔ وہ فوراً روانہ ہو گئے۔ پھر کنڈ سے کابل قریباً بارہ منزل ہے۔ مولانا چوتھے دن رات کے گیارہ بجے کابل میں وارد ہوئے۔ معلوم ہوا کہ پارٹی آج کوچ کر چکی ہے جلال آباد کر کے رات کٹی اور اگلے دن صبح جب کہ پارٹی ابھی بستروں میں چائے نوشی میں مصروف تھی کہ مولانا السلام علیکم کہتے ہوئے ان کے کمرۂ شب خوابی میں داخل ہو گئے۔

مولانا کے مذاکرات :۔

مولانا نے پارٹی لیڈر کو کہا کہ ہم لوگ ایک غلام ملک کے نفر ہیں۔ افغانستان ایک چھوٹا سا آزاد ہمسایہ ملک ہونے کی باعث ہماری جو عزت کر تا رہا ہے۔ دوسرا کوئی ملک ہماری اتنی عزت نہیں کرتا۔ دوسرے ملکوں کے لیے ہندوستانی غلام ایک ذلیل قوم شمار ہوتی ہے۔ اگرچہ یہاں بیٹھ کر ہم نے سب ملکوں سے عزت ہی کرائی ہے۔ مگر جب بحیثیت جہاں ہم کسی جگہ مستقل رہائش پذیر ہوں گے تو یہ عزت حاصل نہ رہے گی۔ اس لیے آپ یہیں رہیے اور مجھے اجازت دیجیے کہ میں محمد حسن کے سوا باقی پارٹی کے لیے واپسی کا حکم امان اللہ خان والئے افغانستان سے حاصل کر سکوں۔ کیونکہ اصل میں حکم محمد حسن ہی کیلیے تھا۔ مگر چونکہ اسی پارٹی کارکن تھا اور کارکردگی اگرچہ کسی شخصیت کے نام سے تھی۔ مالی طور پر ساری پارٹی مستفید ہوتی تھی۔ اس لیے پارٹی ممبروں نے فرداً فرداً امان اللہ خان سے یہ کہہ کر اس سفر میں شرکت کر لی تھی کہ اگر آپ محمد حسن کو اخراج کا حکم دیتے ہیں تو میں بھی اس کے ساتھ چلا جاؤں گا۔ ان کا خیال تھا کہ امان اللہ خان اس طرح دباؤ میں آ کر حکم اخراج محمد حسن واپس لے لے گا مگر جوں جوں پارٹی کے افراد امان اللہ خان سے اپنی شرکت کی نیت کہتے رہے۔ وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوتا گیا کہ ہر شخص جو اس معاملہ میں شرکت کی خواہش رکھتا ہے۔ محمد حسن کے اس جرم میں شریک ہے۔ مولانا بشیر صاحب خود بھی اس راز سے باخبر تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ لوگ امان اللہ خان کی جگہ ہو کر خود سوچیے کہ اگر اکیلا محمد حسن اس وقت چلا جاتے اور میں امان اللہ خان سے اس حکم پہ ایک سال کی

شرط لگسوالوں تو کیا حرج ہے۔ کیا آپ امان اللہ خان کو اتنا ذلیل کرنا چاہتے ہیں کہ اس نے ایک شخص کے لیے مجبوراً اگر کوئی فیصلہ کیا ہے تو آپ ان کو اتنا حق بھی دینے کو تیار نہیں ہیں۔

پارٹی لیڈر کی شرمندگی :۔

ادھر مولانا پارٹی کی خیر خواہی میں گھلے جا رہے تھے کہ یہ لوگ غیر ملکوں میں جا کر ذلیل نہ ہوں کیونکہ روس سے روپیہ لے کر وہ اپنی سابقہ عزت کھو چکے تھے کہ پارٹی لیڈر پر اپنی سازش سامنے آکر انفعال کی کیفیت نمودار ہونے لگی۔ مولانا نے جب یہ کیفیت دیکھی تو مولانا نے بات کو ایسا ٹال دیا کہ پارٹی لیڈر اور ممبروں کو یقین یہ ہو گیا کہ بشیر صاحب کو ہماری سازش کا کوئی علم نہیں بلکہ ہمارا فرستندہ کسی اور حادثے کا شکار ہو گیا یا روپیہ لے کر کہیں فرار ہو گیا ہے مولانا کا بیان تھا کہ پارٹی لیڈر شرمندگی سے اتنا مغلوب ہو گیا تھا کہ ان کے منہ سے میاں عبیدالباری کا لفظ ایسے لہجے سے نکل گیا۔ گویا کہ عبیدالباری نے ہماری مرضی کے خلاف یہ سازش کی تھی "مدبشیر صاحب کے سامنے عبیدالباری سے آگے کوئی لفظ بھی وہ نہ نکال سکے اور جب انہیں مولانا کی لاعلمی کا یقین ہو گیا تو ان کی سابقہ معمولی حالت عود کر آئی۔ پارٹی کو یقین تھا کہ جو لوگ ہمیں کابل میں بیٹھے اتنا روپیہ بغیر حساب دیتے رہے ہیں وہ ہماری مہمانی کیوں نہ اٹھائیں گے مگر مولانا بشیر صاحب کا خیال عملاً صحیح نکلا اور پارٹی نہ صرف ذلیل ہوئی بلکہ منتشر ہو گئی۔ کابل میں جو عزت ان کو حاصل تھی وہ پھر کبھی نہ حاصل ہو سکی اور پارٹی جو کابل میں ایک عظیم محل میں فروکش تھی۔ کسی جگہ بھی نہ جم سکی آخر جہاں کسی کے سینگ سمائے رک گیا۔ کئی ممبر واپس وطن کو رجوع ہوئے۔ خود پارٹی لیڈر (عبیداللہ سندھی صاحب) کچھ عرصہ حجاز میں مقیم رہا۔ بالآخر ہندوستان آکر اسلام کو کیمونزم کا حاشیہ بردار ثابت کرتے کرتے اللہ کو پیارے ہو گئے اور مسلمان نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلامی کیمونزم کا تحفہ سپرد کر گئے۔ چنانچہ اس وقت بھی ان کے حاشیہ بردار ایک ادیب محمد سرور حضرت شاہ ولی اللہ رحمت اللہ علیہم کے لیے ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ کیمونزم کے ظہور سے کافی پہلے حضرت شاہ صاحب اسلامی کیمونزم کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔ بات کچھ موضوع سے دور چلی

گئی ہے۔ مولانا کے کردار کا ذکر تھا کہ وہ اپنے مسلمان دشمنوں کو معذور جان کر چشم پوشی فرماتے تھے۔

مولانا بشیرؒ اور مولانا مودودیؒ :۔

اُن کی شہادت کا واقعہ تو اس دلیل کی موثق تائید کرتا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں یکم رمضان مبارک کی پہلی شب وہ سحری سے پہلے شہید کیے گئے تجہیز و تکفین کے بعد ان کے بستر کو اٹھا کر دیکھا گیا تو تکیے کے نیچے سے ایک رقعہ برآمد ہوا جس میں تحریر تھا کہ میرے قاتل سے قصاص نہ لیا جائے۔ کیونکہ اس غریب کا اپنا نہیں ہوگا بلکہ وہ کسی درپردہ قوت کا ہاتھ ہوگا۔ قتل سے پہلے اتنی بندی کا کیا یہ مطلب نہیں کہ ان کو درپردہ قوت کا علم حاصل تھا مگر انہوں نے اس کا اعلانیہ فاش کرنا مناسب نہ سمجھا۔ گویا وہ بزبان خموشی یہ کہہ گئے کہ اب میدان کار تبدیل کر دینا چاہیے اور انہی دنوں مولانا مودودی خدمت حق کے لیے میدان میں نکل آئے۔ واللہ اعلم۔

چمرکنڈ کے حالات :۔

ناظرین تحریک کے پس منظر سے قدرے متعارف ہو چکے اب چمرکنڈ کے موجودہ حالات ملاحظہ فرمائیں۔ لشکر چار جماعتوں میں منقسم تھا جن کے نام حسب ذیل تھے۔

(۱) بڑی جماعت میں اکثریت اہل پنجاب کی تھی۔

(۲) مودی خانہ جماعت اس میں سب بنگالی تھے۔

(۳) سرکاری جماعت میں ملے جلے بھائی تھے تناول کم باقی سب تقریباً برابر۔

(۴) ہندوستانی جماعت میں اکثریت یوپی بہار کے لوگ تھے کچھ لوگ پنجاب کے اور چند تناول کے ہم چاروں عیالداروں کو ایک ایک جماعت کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ مجھے ہندوستانی جماعت میں شامل کیا گیا۔

ہمارے چمرکنڈ میں داخلہ کے چند دن بعد جناب مولانا فضل الٰہی صاحبؒ وزیر آبادی

جماعت ہجرت کے مرکز میں فرنگی گرفت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو کر چمرکنڈ سے ہوتے کابل میں اکابرین افغانستان سے ملاقات کرنے چلے گئے تھے۔ واپس چمرکنڈ پہنچ گئے صاحب موصوف کابل میں مولانا بشیر صاحب سے جماعت کے موجودہ حالات اور آئندہ لائحہ عمل کے متعلق مشورہ بھی کر آئے تھے چنانچہ ان کی آمد پر جماعت میں کافی ہل چل شروع ہو گئی تو وارد ہونے کی وجہ سے ہمیں اندرونی گفتگو کا تو پتہ نہیں تھا ظاہر جو کچھ ہم جان سکتے تھے۔ یہ تھا کہ بعض لوگ جو در پردہ نعمت اللہ صاحب کے طرفدار تھے جو یو پی اور بنگال سے آئے ہوئے تھے۔ مولوی فضل الٰہی پر ناراضگی کا اظہار کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پنجابی جو پہلے بالکل چپ سادھے وقت گزار رہے تھے ان کی آمد پر کچھ ہوشیار ہو گئے ہیں اور وہ پنجابیوں کی حرکت کو ناپسند کرتے تھے اور ہندوستانی اور بنگالی انتشار کے لیے خطرے کا پیش خیمہ خیال کرتے تھے مگر وہ مولانا موصوف کے اس موقف کی علانیہ مخالفت کی جرأت نہ رکھتے تھے۔ جو مولانا نعمت اللہ صاحب کی فرنگیوں کی صلح کے جواب میں مولانا فضل الٰہی اور تمام جمعیت چمرکنڈ نے مجبوراً اختیار کیا تھا اور یہ موقف اتنا صحیح اور واضح تھا کہ خود مولانا نعمت اللہ کے حامی اس کی حمایت پر مجبور تھے۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے نعمت اللہ صاحب کے حامیوں نے ہندوستانی بنگالی سوال کو اجاگر کرنے کی کوشش کی مگر بروقت مولانا عبدالکریم صاحب کی مداخلت اور تبلیغ کے باعث ناکام رہے۔

باہمی صلح کی کوشش :-

آخر کئی دنوں کی کشمکش کے بعد طے ہوا کہ اس معاملے کو چمرکنڈ میں نزاع کا باعث بنانے کی بجائے امیر نعمت اللہ صاحب پر تمام حجت کے لیے ان سے خط و کتابت کی جائے۔ اگر وہ چمرکنڈ والوں کی شرائط مان لیں تو بہتر ورنہ چمرکنڈ اپنی کامل علیحدگی کا اعلان کر دے اس سے پہلے چمرکنڈ کو تمام اخراجات امیر نعمت اللہ صاحب ہی بھجواتے تھے اور عملاً چمرکنڈ ان کے ماتحت تھا اگرچہ ظاہراً ایسا نہیں تھا مگر مولانا فضل الٰہی صاحب کی چمرکنڈ میں موجودگی کا مطلب یہ تھا کہ اب جماعت کے انصار کی اکثریت چمرکنڈ کی طرف راغب ہو جائے گی اور چمرکنڈ مرکز کی اعانت کا محتاج نہیں رہے گا۔ بشرطیکہ تمام حجت کی ناکامی کے بعد چمرکنڈ

علیحدگی کا اعلان کر دے۔ اب خط وکتابت شروع ہو چکی تھی جس سے بظاہر ہم نو وارد لوگ ناواقف رکھے جا رہے تھے مگر جماعت کی ہر قسم کی خدمت کو بغیر حیل و حجت ادا کرنے کا میرا جذبہ میری رکاوٹ دور کرنے کا باعث بنا۔ اول اول تو بعض مقتدر لوگ میری معلومات کا باعث بنے گو آہستہ آہستہ اوپر کا طبقہ میری طرف متوجہ ہوا۔ چنانچہ چند دن ڈاک کی آمد ورفت کے بعد ایک آخری چٹھی بھی عوام کے علم میں لانے کی ضرورت محسوس کی گئی اور عوام کے سامنے چٹھی سنانے کی خدمت مجھ عوامی کے سپرد کی گئی۔ چٹھی کے مضمون نے عوام کو مطمئن کر دیا۔ اور اکابرین میرے طرز بیان سے متاثر ہوئے اور اس کے بعد جماعت کی خدمات کے لیے مجھے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے کا موقعہ ملنا شروع ہو گیا۔ چٹھی کا مضمون کچھ اس طرح کا تھا جیسے ایک فریق دوسرے فریق کو شرائط صلح پیش کرے۔

(۱) امیر نعمت اللہ صاحب فرنگی سے صلح توڑنے کا اعلان کرے۔

(۲) آہستہ آہستہ تمام لشکر اسمست سے چمرکند منتقل کر دیا جائے۔

(۳) تمام لشکر کے منتقل ہونے تک چمرکنڈ کو فراخی سے روپیہ دیا جائے۔

(۴) امیر لشکر اعلان کرے وزیرستان میں جہاد حتے الوسع جاری رکھا جائے گا۔

(۵) وزیرستان میں جہاد کے لیے خرچ وسیع پیمانہ پر دیا جائے۔

ڈاک جانے کے بعد ڈاک کا انتظار رہا۔ کئی دن جواب نہ آنے پر پھر مجلس مشاورت منعقد ہوئی جس کے نتیجے میں جناب مولانا عبد الکریم امیر چمرکنڈ اسمست میں امیر مرکز سے بالمشافہ گفتگو کرنے کے لیے تشریف لے گئے اور یہ ان کا آخری سفر ثابت ہوا۔

چمرکنڈ میں ترقی ہو رہی تھی۔ مولوی فضل الٰہی صاحب کی رہائش کے لیے مکان تیار ہو رہا تھا۔ بندوق سازی کا کارخانہ تیار ہو چکا تھا۔ اور اس کا فرنیچر بن چکا تھا اور مستری خیر دین کو جو ہمارے ساتھ جلال آباد سے آئے تھے۔ مزید سامان لانے کے لیے ہندوستان بھیجا گیا اور وہ ابھی آگرہ اڈے درست کر رہے تھے مجھے بھی ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ ہو چکا تھا تاکہ لکڑیوں کے کارخانہ کا سامان لے آؤں جس کی تجارت شروع ہو چکی تھی کہ اسمست سے ڈاک آگئی جس کے نتیجے میں مولانا کو اسمست میں امیر مرکز نے طلب کیا تھا۔ غالباً مولانا عبد الکریم صاحب کے

ایک مہینہ بعد مولانا یوسف مرکز امست کی طرف مراجعت فرما ہوئے یہ ان کا آخری سفر تھا۔ وہ واپس نہ لوٹ سکے۔

افسوسناک واقعہ:۔

امیر نعمت اللہ صاحب نے جو امست کے امیر تھے۔ مولانا یوسف اور مولانا عبد الکریم کو اپنے پاس طلب کیا اور ایک اخبار دکھایا کہ تم لوگ میرے ساتھ دغا کر رہے ہو جب کہ چمرکنڈ میں مولانا فضل الٰہی نے اپنی امامت کا ڈھنڈورا پیٹ دیا ہے۔ اور آپ لوگ میرے ساتھ سمجھوتے کر رہے ہو۔ دونوں نے لاعلمی ظاہر کی اور مولوی یوسف صاحب نے بہت جلد چمرکنڈ پہنچ کر صورت حال کی اصلاح کی کوشش کا ارادہ ظاہر کیا۔ چنانچہ بارہ، چودہ مجاہدین کی ہمراہی میں تیار ہو گئے۔ عین رخصتی کے وقت جس وقت بھائی لوگ معانقہ میں مصروف تھے کسی نے (جو پردہ میں ہی رہا) مولانا یوسف کو آگاہ کیا کہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ وگرام کیا ہے اس سفر کا؟ انھوں نے کہا جلدی بتاؤ۔ وہ بولا تم راستے میں شہید کر دیے جاؤ گے۔ اور چمرکنڈ پہنچ کر مولانا فضل الٰہی کو شہید کر دیا جائے گا۔ اور یہاں سے تین آدمی ریل کے ذریعہ وزیرستان جائیں گے اور مولوی بشیر صاحب کو شہید کر دیں گے یہ خبر ایسے وقت میں ملی جب کہ مولانا یوسف صاحب اس نتیجے پر پہنچے کہ کیوں نہ میں قربان ہو کر فضل الٰہی صاحب اور بشیر صاحب کو بچانے کی کوشش کروں۔ چنانچہ اسی قاصد کو خبر کرنے کی ڈیوٹی سپرد کر کے خود امیر صاحب سے بولے کہ ایک عرض آپ کی خدمت میں کرنے کی ہے۔ وہ بولے کہو۔ یوسف صاحب بولے علیحدگی میں عرض کروں گا۔ چنانچہ وہ باغ کی طرف آگے آگے چلے۔ یوسف صاحب نے مجاہدین کی نظروں سے اوجھل ہونے کا انتظار کیا۔ جب یہ موقع آگیا تو انھوں نے وقت ضائع کیے بغیر امیر صاحب پر تین فائر کر دیے۔ تینوں گولیاں دماغ میں لگیں اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ یوسف صاحب اس کے بعد لشکر کی طرف پلٹے۔ لوگوں نے پوچھا کیا ہے فائر کہاں ہوئے وہ بولے میں نے امیر کو مار دیا ہے اس کے بعد مجمع بے قابو ہو گیا اور انھوں نے بندوقوں کے کندوں سے ان کو مارنا شروع کر دیا وہ ایک دیوار کے سہارے

کھڑے ہوئے اور نصر من اللہ و فتح قریب ان کی زبان پر جاری تھا۔ جتنے کہ کسی نے ان پر گولی چلادی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ اس کے بعد محمد ایوب پنجابی بھاگنے لگا۔ اس کو بھی گولی مار دی گئی اور یوسف صاحب اور ایوب صاحب دونوں کی لاشوں کو لکڑیوں کے انبار پر ڈال کر آگ آگ لگادی۔ اس کے بعد اپنا امیر مولوی رحمت اللہ صاحب کو منتخب کیا اور امیر لشکر کو بڑے اعزاز سے دفن کر دیا۔ اس واقعہ کے دوران مولانا عبدالکریم صاحب نے قرآن شریف ہاتھ میں لے کر اعلان کیا کہ میرا ان واقعات سے کوئی تعلق نہیں اور کہ میں اپنی برئیت کا اعلان کرتا ہوں

بکین کا سفر :-

دسمبر ۱۹۲۱ء میں مجھے ایک سفر پیش آیا۔ میرے ساتھ حاجی عبدالحلیم صاحب تھے اور ہم بکین کے لیے روانہ ہوئے۔ ہم پہلی رات چمر کنڈ سے چھ میل دریائے کنڑ کے کنارے رکی میں دوسری اسلام آباد اور تیسرے دن عصر کے قریب جلال آباد پہنچ گئے وہاں ہمیں عبدالغنی صاحب بھی مل گئے۔ عبدالغنی ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ اب ہم تین ہو گئے ہیں۔ سفر آرام سے کٹے گا۔ ایک دن ہم نے بھی جلال آباد میں قیام کیا۔ اگلے دن علی الصباح ہم لسوئے وزیرستان روانہ ہو گئے۔ پہلی رات ماماخیل چھاونی میں بسر کی۔ یہ یوسف صاحب کے پاس گزاری۔ موصوف نے بہت خاطر تواضع کی اور کھانے میں تو خاص طور پر اپنے ساتھ بٹھایا اور ایسی طرز اختیار رکھی گویا ہم ان کے پیر یا بزرگ ہوں۔ حالانکہ عمر میں وہ ہم سے دو چار سال بڑے ہی ہوں گے۔ رخصت کے وقت ہمیں بڑے احترام سے رخصت کیا اور حاکم علاقہ کے نام چٹھی دی جس میں باآرام منزل مقصود پر پہنچانے کے انتظامات کے احکام رقم تھے۔ دن بھر سفر کرنے کے بعد ہم حاکم علاقہ کے پاس جا پہنچے حاکم نے ہماری اتنی مدارت تو نہ کی تاہم ہماری شب باشی کا اچھا انتظام کر دیا۔ اگلے دن اپنے ماتحت ایک ملک کے نام ہمیں بذریعہ نرازی (حاجی) چھاونی پہنچانے کا حکم لکھ دیا۔ دن کے دس بجے کے قریب ہم لوگ ملک مذکور کے پاس پہنچے۔ ملک کو حاکم صاحب کا

حکم نامہ دکھایا۔ ملک حکمنامہ دیکھ کر بہت حیران ہوا اور حاکم کی نادانی پر افسوس کرنے لگا۔ ملک کی بستی پہاڑ کی جڑ میں تھی۔ بہت بلند پہاڑ سامنے کھڑا تھا وہ بولا یہ پہاڑ دیکھتے ہو اس پر جو قوم رہتی ہے وہ شاہ افغان کی پرواہ نہیں کرتی۔ میرا یہ رقعہ اس کے سامنے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ تم واپس چلے جاؤ۔ آگے جانے کا خیال ترک کر دو۔ وہ پشتو میں کہہ رہا تھا ہم تینوں اس کے پیچھے گرگئے تھے۔ حاجی صاحب نے جو ہم سے پانچ سال پہلے سے لنکا میں آئے ہوئے تھے اور ایک بار وزیرستان بھی جا چکے تھے کچھ بول نہ سکے۔ آخر میں نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ اور اشاروں کی مدد سے اس کی بات نہ ماننے اور سفر جاری رکھنے کا اصرار کیا تو وہ بولا کہ جو حشر تمہارا پہاڑ پر جاکر ہوگا بہتر ہے کہ وہ یہیں پر کر دوں۔ تاکہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ میرے ہاتھ لگے۔ میں نے اپنے کوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے کہا کہ یہی تو ہماری آخری آرزو ہے وہ کسی کے ہاتھوں پوری ہو۔ ساتھ تو ہمارا ٹھیک ہے (یعنی اللہ کی رضا) وہ ہنس پڑا۔ اور پھر سمجھانے کے طور پر بولا ضد نہ کرو۔ پہاڑ پر مقیم قوم بڑی جابر اور ظالم ہے۔ میں تمہیں کیسے سمجھاؤں تم اچھی طرح بات نہیں سمجھتے۔ میں نے کہا کہ ہم لوٹ سکتے ہیں اس شرط پر کہ تم اس حکمنامہ پر اپنا عذر لکھ دو۔ وہ پریشان ہو گیا اور لکھ کر دینے کی بجائے ہمارے ساتھ حاکم علاقہ کے پاس خود جاکر عذر کرنے کے لیے روانہ ہو گیا۔ واپسی پر ہم دو میل بھی نہ گئے ہوں گے کہ خانہ بدوشوں کے ایک چھوٹے سے قافلہ کو دیکھ کر وہ ان کی طرف بڑھا اور کچھ دیر ان سے مخاطب ہو کر مع ایک اور ساتھی کے ہماری طرف پلٹا۔ اور بولا کہ تمہارے آگے چلنے کا بندوبست ہو گیا ہے نہیں تو نازی چھاؤنی تک پہنچانے کے دس روپے دینے پڑیں گے ہمارے تسلیم کرنے پر وہ بولا کہ تم میرے ساتھ میرے مکان پر واپس چلو۔ رات تک یہ آدمی وہاں پہنچ جائے گا اور کل صبح تم اس کے ساتھ آگے روانہ ہو جاؤ گے۔ ہم اس کے ساتھ واپس لوٹے۔ شام کو خانہ بدوش پہنچ گیا۔ اگلے دن ہم اس کے ہمراہ روانہ ہو گئے اور ملک کے ہاں ½ ۱ انچ موٹی اور ½ ۲ فٹ چوڑی سفید مکئی کی روٹی چاروں نے مزے لے لے کر کھائی۔ سبحان اللہ۔ الحمد للہ۔

آخری منزل :۔

ہم پہاڑ پر چڑھ کر سیدھے جنوب کی طرف جا رہے تھے ۔ کچھ لوگ ہمارے آگے اور پیچھے بھی رواں تھے کہ ہمارا ساتھی مغرب کو گھوم گیا ۔ سمت سفر اور لوگوں کو سیدھے جاتے دیکھ کر میں نے کہا کہ تم سمت کیوں چھوڑ رہے ہو جبکہ لوگ سیدھے جا رہے ہیں وہ بولا راستہ تو سیدھا ہی نزدیک ہے مگر اس راستے پر ایک اور قوم پڑتی ہے وہ شیعہ ہیں اور بہت ظالم ہیں ۔ ہماری قوم اُن سے کمزور ہے اس لیے وہ پرخطر راستہ ہمارے لیے بہتر نہیں ۔ اس طرح ہمیں ایک دن زیادہ تو سفر کرنا ہو گا مگر راستہ محفوظ ہے ۔ شام کو ہم اس کی بستی میں پہنچے اور وہاں سے اگلے دن ہم شام سے ذرا پہلے زانہ ہی پہنچ گئے اور چھاؤنی میں کرنل کے مہمان بنے ۔ اگلے دن ہم نے بکنی چھاؤنی میں رات گذاری اور وہاں سے اگلے دن نگل چھاؤنی میں پہنچے ۔ یہ مقام درے میں آب دوان کے کنارے واقع ہے ۔ جہاں بنگالی اور ہندوستانی اصحاب کے جانے کے بعد تقریباً بیس مجاہد پنجابی فروکش تھے ۔ یہاں سے خوست دو منزل ہے جو ہم نے ایک دن میں طے کیا خوست میں دو دن مولوی یعقوب صاحب (سفر در کابجیٹ مدیر غازی اور گورنر جنوبی شاہ محمود صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری تھے کے پاس بظاہر وہ یہ سب کچھ تھے ۔ مگر دراصل جماعت مجاہدین کی طرف سے مولانا بشیر صاحب کے حکم سے یہاں مقیم تھے دو دن خوست میں مقیم رہ کر وہاں سے تین دن میں مکین وزیرستان کے مرکز میں وارد ہوئے ۔ چمرکنڈ سے سولہویں دن ہم مکین پہنچے ۔ مکین میں پہنچ کر حاجی صاحب اور مولوی عبدالغنی صاحب لشکر میں جو مولوی صاحب کی غار سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا چلے گئے اور میں غار میں رہ گیا ۔

مکین کی تباہی :۔

تقریباً پندرہ دن ہم مکین میں رہے ۔ ان دنوں کوئی خاص واقعہ نہیں پیش آیا ۔ میں نے مکین کی بستی کی تباہی کا منظر دیکھا ۔ تمام مکانات توپ کے گولوں سے منہدم ہو چکے ہوئے تھے

تمام محسود غاروں میں زندگی بسر کر رہے تھے بستی کی قابل کاشت زمین جو بیڑھی نما چھوٹے چھوٹے کھیتوں پر مشتمل تھی اس میں قریباً چھ فٹ گہرے اور سات فٹ چوڑے گولائی میں گڑھے پڑے ہوئے تھے جو مزید حملوں کو ملحوظ رکھ کر ویسے کے ویسے ہی چھوڑ رکھے تھے۔ جنوری ۱۹۲۲ء شاید دونوں طرف سستانے کے لیے جنگ بند تھی، اور خاموشی آئندہ پیش آنے والی شدید جنگ کا پیش خیمہ خیال کی جاتی تھی۔ اس کا بیان اپنی جگہ پر ہو گا۔

کابل کا سفر:۔

مولانا بشیر صاحب ہمارے ساتھ عازم کابل ہوئے۔ اس قافلے میں کل سولہ نفر تھے میرے اور حاجی عبدالحلیم صاحب کے علاوہ مولانا بشیر سمیت چودہ مزید مجاہد ہمسفر تھے جو براستہ کابل عازم چمرکنڈ ہوئے تھے۔ موسم نہایت خنک جنوری ۱۹۲۲ء کا آخری ہفتہ سواریاں کل تین ایک خچر اور گھوڑا جو ہم چمرکنڈ سے لائے تھے اور ایک گھوڑا جو مولانا بشیر کے لیے نامزد تھا۔ دو ضعیف العمر ایک حاجی عبدالحکیم صاحب اور ایک معاذ صاحب جو بڑے میاں کہلاتے تھے جناب عبدالرؤف صاحب نے مولانا فضل الٰہی صاحب مغفور کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے روانہ کیے تھے۔ جناب حاجی صاحب اسی غرض سے واپس آ رہے تھے۔ ہم کگین سے پچھلے پہر روانہ ہوئے تھے۔ مغرب کے بعد ایک بستی میں جس کا نام معلوم نہیں مگر تھی محسودیوں کی ہم نے ایک محسود ملک کے مکان پر قیام کیا۔ یہاں پر اس قوم کی ایک عجیب رسم کا انکشاف ہوا جس کی سختی کا مولانا بشیر صاحب کو بھی غالباً علم نہ تھا۔ مالک مکان مولانا صاحب ہی کے توسط سے کابل گیا ہوا تھا۔ اس کا تقریباً سولہ سترہ سالہ بیٹا دو دنبے پکڑ لایا۔ وزیرستان کا ہر حصہ جنگ اور قابل زراعت زمین کی کمی کی وجہ سے قحط زدہ حیثیت رکھتا تھا اور اس وقت وہاں ایک دنبہ ساٹھ روپے انگریزی قیمت پاتا تھا۔ مولانا صاحب نے یہ سمجھ کر کہ ایک رات کا کچھ حصہ ہمارا قیام ہو گا۔ علی الصبح ناشتہ بھی ہم کافی منزل طے کر کے کریں گے۔ ہمارا انعزا نا سے بہت مہنگا پڑے گا۔ اس سے پوچھا یہ دو دنبے کیا کرو گے۔ بولا ذبح۔ مولانا نے فرمایا۔ بندہ خدا ایک وقت کا کھانا ہم تمہارے ساتھ

کھائیں گے۔ صبح نہار منہ اندھیرے ہم یہاں سے چل دیں گے۔ تکلف نہ کرو۔ وہ بولا یہاں کا رواج ہے۔ اس کو پورا کرنا ہوگا۔ مولانا نے فرمایا کہ اگر مجبوری ہے تو ایک دنبہ ذبح کر لو۔ ہم دو دنبے ذبح کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے اس نے کہا آپ کی اجازت کا سوال ہے نہ ضرورت۔ آپ بتائیے کہ آپ کو دو دنبے زیادہ عزیز ہیں یا میری جان۔ فرمایا تمہاری جان بہت قیمتی اور عزیز ہے۔ وہ بولا تو پھر یہ دو دنبے بہرحال ذبح ہوں گے۔ اس نے کہا کہ یہاں کا رواج ہے کہ اٹھ مہمان جس گھر پر وارد ہوں وہ ایک دنبہ ذبح کرے آٹھ سے زیادہ مولویوں تک دو اس کے اوپر سترہ سے چوبیس تک ہیں۔ یہ تو غنیمت آپ کے پورے سولہ ہیں اگر سترہ ہوتے تو تین ذبح کرتے۔ مولانا نے فرمایا ہم رعایت کرتے ہیں اور یہاں کونسا شاید یا محاسب بیٹھے ہیں جو بازپرس کریں گے۔ بولا حضرت یوں نہیں۔ صبح جب آپ چلے جائیں گے تو کہاں مخبری کر دے گی کہ اس نے ایک دنبہ ذبح کیا ہے اور میری شامت آجائے گی اور جب میرا والد یہاں پہنچے گا تو سب سے پہلے یہی خوشخبری سنائی جائے گی کہ تمہارے بیٹے نے بستی کی عزت خاک میں ملا دی اور رشتہ غرق کر دی۔ اس کے بعد کیا ہوگا۔ والد صاحب میرا بیان یا عذر سننے کی مہلت ہی نہ دیں گے۔ بس ایک گولی اور میرا خاتمہ۔ اگر آپ کو یہ منظور ہے تو میں آپ کے حکم کی تعمیل کو حاضر ہوں۔ مولانا صاحب کو جب اس رسم کی سختی کا علم ہوا تو اجازت دے دی اور کہا کہ جو چاہو کرو۔ چنانچہ وہ دو دنبے ذبح ہوئے۔

نادر خان کا خون :۔

تیسرے دن ہم خوست پہنچے۔ ایک دن شاہ محمود صاحب گورنر سمت جنوبی برادر خورد نادر خان اور امان اللہ خان والئے افغانستان کے بہنوئی کے ہاں قیام رہا موصوف مولانا کے بہت معتقد اور شاگرد کی حیثیت رکھتے تھے۔ مولانا جلد ہی کسی نا معلوم کشش کے باعث سفر جاری رکھنا چاہتے تھے اس لیے غازی محمود کے اصرار کے باوجود سازم کابل ہوئے۔ کافی رات گئے ہم جیدران قوم کے سردار ملک میرک کے

قیام پذیر ہوئے۔ افغانستان میں ملک ہیرک بہت بڑا دولتمند اور غازی امان اللہ خان کا ذاتی دوست اور بھائیوں سے زیادہ عزیز تھا۔ اب ہمارا سفر برف میں ہو رہا تھا۔ ہم علی الصبح چل پڑتے اور شام تک چلتے۔ ایک دن شام کے وقت ہم ایک بستی کے سامنے جا رکے تا کہ رات کے قیام کا انتظام کریں۔ اس بستی میں کوئی مرد موجود نہ تھا عورتوں نے کہا کہ ہمارے پاس کچھ کھانے کو نہیں۔ ہمارے مرد تلاش خوراک میں ہیں۔ یہاں موجود نہیں اس لیے ہم مجبور ہیں۔ لاچار ہم آگے روانہ ہو گئے۔ برف کی مدہم روشنی میں ہم لوگ رات کے بارہ بجے ایک بستی میں بقایا رات کے لیے ٹھہر گئے۔ سب ساتھی تھکان سے چور نیند سے مغلوب ہو گئے ہیں مولانا کی ذات کے مطالعہ کے لالچ میں رہتا تھا میں نے دیکھا کہ مولانا نے جب چائے اور کچھ کھانے کا انتظام کر لیا تو رات کے دو بجے تھے اب مولانا ہنس ہنس کر ساتھیوں کو بیدار کر کے کھانے کی دعوت دے رہے تھے۔ ہم شام کے وقت گردیز پہنچے۔ نماز سے فراغت کے بعد ہم ابھی کمریں کھولنے کی تیاری میں تھے کہ کابل سے نادر خان صاحب وزیر جنگ کا ٹیلی فون آیا کہ "میں سمت مغربی کا رئیس تنظیم نامزد کیا گیا ہوں۔ روس نے بخارا میں جبر اور ظلم مچا رکھا ہے۔ افغانستان کو اس کے اثر سے محفوظ رکھنے کے لیے میرا یہ سفر بہت اہم ہو گا۔ میں آپ سے کچھ مشورے اور ہدایات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے آپ جلدی پہنچیں" چنانچہ اسی وقت ہمیں سفر جاری کرنا پڑا اور رات کے بارہ بجے ایک سر راہ بستی کی مسجد میں قیام پذیر ہوئے۔

مولانا بشیرؒ کی شخصیت :۔

آج پھر وہی نقشہ دیکھنے میں آیا۔ رات کے دو بجے کے قریب مولانا بشیر ساتھیوں کو بیدار کر کے ماحضر تناول کروانے کی تگ و دو کر رہے تھے اگلے دن بارہ بجے گہری برف کی کھوہ میں ہم التمرہ کی چوٹی عبور کر رہے تھے۔ اہل ملک اس وقت گھروں میں دب کے بیٹھے آگ تاپ کر وقت گذار رہے تھے اور ہم کم از کم دو فٹ برف میں برف باری کے دوران سفر کر رہے تھے ہم نے دیکھا کہ بستیوں کے مکین اپنے مکانوں سے ہمیں جھانک رہے تھے۔ یہاں پر

اترائی کے دوران بستی ہمارے بائیں جانب چھوٹ رہی تھی کہ اچانک مولانا صاحب لڑھکے اور پیٹھ کے بل گر کر سیدھے لیٹ گئے۔ غالباً ان کی قبا پھنس گئی تھی جو برف کے سبب بھاری ہو گئی تھی۔ مولانا صاحب کی یہ ہیئت گذائی دیکھ کر حافظ عبدالاحد مرحوم دغفور کر گئے مگر میں نے مولانا صاحب سے پوچھا مولانا صاحب کیا وقت ہے۔ مولانا صاحب جھٹ بولے بارہ بجے ہیں۔ گویا قیلولہ کر رہا ہوں۔ اسی طرح ہنسی خوشی عشا تک سفر جاری رہا جس جگہ آج ہمارا قیام ہوا یہ ایک وادی تھی کابل سے دو دن سفر کی منزل یہاں برف کچھ پیچھے کی نسبت کم تھی۔ رات کو سونے سے پہلے مولانا نے ظاہر کیا کہ کل مجھے کابل پہنچنا چاہیے۔ آپ لوگ پرسوں تک کابل پہنچ سکیں گے۔ اس لیے کل کے لیے مجھے گھوڑا دے دو ایک نوجوان یوسف میرے ساتھ ہو گا۔

(یوسف آج کل کیمپ میں مقیم ہے وہاں سے لشکر ۱۹۳۵ء میں مولانا کی وفات کے بعد اٹھ چکا تھا۔ اس کی دو محمود بیویاں ہیں۔ لوگ اس کی بہت عزت کرتے ہیں اس کا بیٹا ۱۹۵۹ء میں مجھے ملا تھا اپنے باپ کے حالات بتا رہا تھا پچھلے سفر میں تین سواریاں اور سولہ نفر تھے اور تمام سفر مولانا نے اپنی باری استعمال نہیں کی۔ بلکہ ہر دو ضعیف العمر خصوصاً میاں معاذ کو اپنی باری سوار کراتے رہے۔ اگلے دن مولانا یوسف صاحب ہم سے علیحدہ ہو گئے کابل پہنچنے کی جلدی میں وہ آگے آگے روانہ ہو گئے تاکہ پروگرام کے مطابق نادر خان صاحب سے ملاقات کر سکیں اور ہم دوسرے دن قبل شام کابل وارد ہوئے۔ کابل میں اس دفعہ سردار نصراللہ خان کی کوٹھی میں ہمارا قیام تھا۔ برف باری زوروں پر تھی۔ مولانا دن بھر بلکہ رات کے دس گیارہ بجے تک وزارتوں اور سفارتوں کے چکر میں مصروف رہتے۔

کابل میں تقریباً پندرہ روزہ قیام کے بعد حاجی عبدالحلیم صاحب۔ میاں معاذ صاحب اور راقم کو عین برف باری کے دوران چمرکنڈ روانہ ہونے کا حکم ملا۔ ہم وہی خچر اور گھوڑا ساتھ لے کر عازم چمرکنڈ ہو گئے۔ راستے کی تکلیف یا راحت کی سرگزشت طوالت کے خوف سے نظرانداز کر کے بس اسی پر کفایت کرتا ہوں کہ چھٹے دن چمرکنڈ پہنچ گئے جماعت میں ایک ہینڈ پریس موجود تھا جو پریس مین اور کاتب نہ ہونے کی وجہ سے

بے کار پڑا تھا۔ امیر صاحب نے پریس مین کا کام سیکھنے کے لیے مجھے تیار کیا۔ میں کام سیکھنے کے لیے جلال آباد سمیت خان محمد چلا گیا۔ جب میں پندرہ دن بعد جلال آباد سے واپس آیا تو میرے دیگر فرائض کی وجہ سے مجھے پریس خود چلا سکنے کا وقت ہی نہ نکل سکتا تھا اس لیے ایک مہاجر جو جلال آباد کنڈک سے میرے ساتھ چمرکنڈ آ چکا تھا۔ پریس کا کام کرنے کے لیے منتخب کیا گیا اور میں اسے جلال آباد ساتھ لے کر چلا گیا اور اسے وہاں عبدالرشید (آمائل شرحعانند) کے سپرد کر آیا۔

عبدالرشید صاحب کا ذکر اس سرگذشت میں اکثر اپنے موقعہ پر آئے گا۔ اس مقام پر ان کا مختصر تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ دلّی کے قریب غالباً ضلع مظفر نگر کے پاس تھے۔ تحریک ہجرت میں یہ بھی مہاجر ہو کر افغانستان میں وارد ہوئے اور پھر پھرا کر جلال آباد میں مقیم ہو گئے۔ خوشنویس تھے۔ اخبار اتحاد مشرقی جو ان دنوں جلال آباد سے مولانا برہان الدین کشکی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، بحیثیت کاتب ایک سو روپیہ کابلی معاوضے پر مامور ہو گئے۔ بیوی اور تیرہ چودہ سال کا لڑکا بھی ساتھ ہی تھا۔ قلعہ تورجو ابتدا میں مہاجرین کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا صوبے دار محمد یوسف مہاجر (جو کنڈک مہاجرین میں بحیثیت صوبیدار مامور تھے) کے ہمسائے میں رہائش پذیر تھے۔ صوبیدار صاحب موصوف ہی کے ذریعہ میرا ابتدائی تعارف ہوا تھا کیونکہ میں جلال آباد کے سفر کے دوران عام طور پر صوبیدار صاحب ہی کے ہاں قیام کرتا تھا۔ دونوں حضرات درد مند دل رکھتے تھے اور بڑے اچھے ہمسایوں کی طرح رہ رہے تھے۔ بیویوں میں بھی بہت محبت تھی اور اخلاص بھی۔

جلال آباد میرا اکثر آنا جانا ہوتا تھا اور اکثر مستری خیردین صاحب سے بھی ملاقات ہو جاتی وہ اپنے ہاں قیام پر مجبور کر دیتے۔ چنانچہ اس سفر میں مستری صاحب کے اصرار پر ان کے پاس قیام پذیر ہوا اور فضل الرحمٰن کا قیام پریس میں ہی کرا دیا تھا۔ مستری صاحب اکثر مولوی اللہ نواز صاحب سے ملتے دیکھتے تھے وہیں سے خبر لائے کہ مولانا بشیر صاحب کابل سے چمرکنڈ کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔ ٹیلی فون پیمان کو خبر مل چکی تھی

میں دو دن مولانا کے انتظار میں رکا۔ بالآخر مولانا صاحب تشریف لے آئے۔ اس دفعہ مولانا کے ہمراہ ایک نیا شخص ابراہیم نامی بھی ہمسفر تھا۔ جس کا بیان تھا کہ وہ یوپی کا باشندہ ہے اور کہ وہ ان تین میں سے ایک ہے جو دشت پامیر[۱] کو اکیلے عبور کر چکے ہیں۔

اس دفعہ اپنے بھائیوں میں سے عبداللہ پنجابی کابل میں ہی رک گیا تھا اور اس نے جمعیت مجاہدین کا ساتھ چھوڑ کر مولانا عبیداللہ صاحب سندھی اور ان کی پارٹی کی معیت اختیار کر لی تھی۔

اخبار کا اجراء۔

مولانا بشیر مرحوم و مغفور کے ہمراہ ہی جلال آباد سے میں بھی چمرکنڈ واپس آ گیا۔ ابراہیم مذکور دو تین دن چمرکنڈ ٹھہر کر سید اشاہ میں عزیز ہندی کے پاس چلا گیا۔

مولانا موصوف نے چمرکنڈ پہنچتے ہی چند روز میں اخبار جاری کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ مولانا کابل سے آتے ہوئے چند رم فل سکیپ کاغذ ہمراہ لے آئے تھے۔ اخبار سیکلو سٹائل مشین پر ہی شائع کرنا شروع کر دیا گیا اور اخبار کا کام کتابت اور چھپائی اور ڈاک وغیرہ کا انتظام میرے سپرد کر دیا گیا۔ مگر اخبار کی پیشانی پر مولوی لیسین صاحب بی رائے بحیثیت ناظم شعبہ تبلیغ اور مدیر فاروق ظاہر کیا گیا۔ یہ اخبار والی افغانستان امان اللہ خان اور تمام افغان وزرا اور تمام گورنران افغانستان اور افواج افغانستان کے بڑے افسر محکمہ تعلیم و صحت کے افسران اور افغانستان کے تمام مشہور اکابرین ملوک و خوانین و ملا صاحبان بیرونی دنیا کے مشہور اکابر رضا شاہ کبیر مصطفےٰ کمال لینن اور افغانستان میں مقیم تمام سفارتوں اور افغانی سفارتوں کی معرفت ہر ملک کو روانہ

---

[۱] دشت پامیر چین، روس، افغانستان، ہندوستان، چاروں ملکوں کو جدا کرتا ہے۔ بے آباد دشوار گذار ہے۔ مشہور تھا کہ پہلے روسی پھر انگریز اور تیسرا مذکور ابراہیم دشت پامیر عبور کر سکے ہیں۔

کیا جاتا تھا۔ اندرونِ ہند تمام سیاسی لیڈروں کو بغیر کسی مذہبی تمیز کے خصوصاً کانگرسی لیڈر خلافت کے لیڈر، مسلم لیگ کے لیڈر اور تمام مذہبی پیشوا اور مشہور رسائل کو بھیجا جاتا تھا۔ ہندوستان کے سب گورنروں اور گورنر جنرل تک جاتا تھا۔ اخبار کا نام المجاہد رکھا گیا تھا اور زبان فارسی تھی

افغانستان میں ہماری ڈاک آزاد تھی بغیر کسی ٹکٹ لگے کے ہر اخبار پہنچ جاتا تھا البتہ ہندوستان کے لیے ڈاک کے ٹکٹ منگوا کر چسپاں کیے جاتے اور کسی ذریعے سے پشاور، راولپنڈی یا دیگر کسی شہر کے لیٹر بکس میں ڈلوا دیے جاتے۔ ایڈیٹوریل مولانا بشیرؒ کے ہوتے اور ان کے نیچے فقیر محمد بشیر لکھا ہوتا۔ باقی خبریں جن اخبارات سے لی جاتیں ان کا حوالہ دے دیا جاتا۔ مگر ہر خبر کے نیچے مجاہد کا اپنا نوٹ یا حاشیہ ضرور ہوتا۔ اخبار کی مشہور سرخیاں۔ سیاسیات فرنگ۔ سیاسیاتِ اروپا۔ مکتوب مکین۔ اخبارِ افغانستان۔ اخبارِ ہند۔ سیاسیات عالم۔ سیاسیات عالم اسلام ہوتیں یعنی نادر مضامین پر مولانا عجیب سرخیاں جماتے۔ التثلیث فی التوحید۔ جس کو آج بے شعور پختونستان کا نام دے رہے ہیں۔ اسی طرح ۱۸ نکات کے جواب میں ذالک مالکنا نبغ کی سرخی جما کر مسکت جواب دے گیا تھا۔

اخبار کی پذیرائی :۔

اخبار کے پہلے پرچے نے ہر جگہ اپنا متوقع اثر دکھایا۔ روس۔ ترکی اور ایران، افغانستان میں اخبار کو بہت پسند کیا گیا۔ ہندوستان کے ہر طبقہ نے اپنے اپنے شعور اور حالات کے موافق اثر لیا۔ گورنروں اور گورنر جنرل نے اسے بحق ملک معظم ضبط قرار دیا اور تقریباً ہر پرچہ اسی سرٹیفکیٹ سے مشرف ہوا۔ ہندی پریس نے خواہ مسلم خواہ کانگرسی خوشی کے باوجود خاموشی اختیار رکھی۔ افغانستان کے اتحاد مشرقی کا اپنا مضمون آدھے سے زیادہ المجاہد کے حوالے کی وجہ سے گھٹ گیا تھا اور مکتوب مکین اس کا من بھاتا مضمون ہوتا۔ یہ ناچیز بھی جتنے لائق تھا کر دیتا تھا۔ اخبار کے اجراء سے کچھ مدت پہلے جیسی چمرکنڈ میں کئی کئی دن اخبار کی شکل نظر نہ آتی تھی۔ مگر جن دنوں اخبار کی تیاری ہو رہی تھی مجھے جلال آباد جانا ہوا۔ وہاں میں نے چند اخبار افغانستان کے

علاقہ کے مختلف پتے اور ناموں سے خرید کیے۔ اپنے بھائی فضل الٰہی صاحب مرحوم کو لکھا کہ وہ روپے داخل کر کے یہ اخبارات جاری کرا دیں۔ زمیندار، سیاست لاہور، اور ملاپ پنجاب لاہور، مدینہ، الخلیل بجنور، سلطان بمبئی، اور کئی انگریزی اخبار خرید کیے۔ مولانا برہان الدین کلگتی مدیر اتحاد مشرق سے کہا گیا انہوں نے بتایا کہ جو خبر ہم اپنے اخبار میں جس حوالے سے لکھیں گے اس کا تراشہ اتار کر باقی اخبار اور اگلا اخبار جس سے ہم خبر نہیں لیں گے مع اپنے اخبار کے بھیج دیا کریں۔ ماموں پوستہ (پوسٹ ماسٹر) میرے مہربان تھے انہیں سب نام اور اپنے پتے نوٹ کرا دیے۔ اس طرح ہر تیسرے دن اخبار کا پلندہ ہمیں چمرکنڈ پہنچ جاتا۔ کچھ دنوں کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ایک کاتب تیار کرنا چاہیے اس کام کے لیے عبدالقدیر ایک نئے مہاجر کو میرے ساتھ جلال آباد بھیجا گیا جسے میں نے عبدالرشید صاحب کے سپرد کر دیا اور فضل الرحمٰن جو پریس مین کی تیاری کر چکا تھا اسے واپس چمرکنڈ لے آیا۔ عبدالقدیر پر تین مہینے تک کتابت سیکھ کر تیار ہو گیا (اسی نے بعد میں گرفتار کرایا) اور محمد دین نائیک کی بھی مخبری کی۔

ان دنوں مجھے جلدی جلدی جلال آباد کے سفر درپیش ہوتے رہے۔ جن کا تعلق چھوٹے چھوٹے واقعات سے بھی جڑتا رہا۔ چند سفروں کی یادداشتیں لکھ کر ہدیہ قارئین کیں۔

ہندو نوجوان :۔

ایک دفعہ میں جلال آباد سے آیا تو ایک پکے رنگ کا ہندو نوجوان جو گیروے لباس میں ملبوس تھا چمرکنڈ دیکھا یہ تو مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون صاحب ہیں اور کس تحریک سے وابستہ مگر اگلے ہی دن مجھے حکم دیا گیا کہ انہیں جلال آباد پہنچا کر کابل بخیریت پہنچا دینے کا انتظام کر دوں۔ میں نے اسے کابل پہنچا دینے کا انتظام کر دیا۔ ان دنوں مولوی یعقوب صاحب خوست سے کابل آ چکے ہوئے تھے۔ ان کے ذریعہ اس نے آگے جانا تھا اسے کابل روانہ کر کے میں واپس چمرکنڈ آ گیا۔

کچھ دن ایک سرحدی کا بیٹا جو پشاور کالج سے غالباً بی اے ہو گا اسے جلال آباد پہنچایا مگر ایک تنومند پٹھان ہوتے ہوئے اس نے پیدل چلنے پر ناک منہ چڑھایا۔ سرکاری

تک تو میں اسے پیدل لے آیا۔ اور یہاں سے جالے میں بیٹھا کر بذریعہ دریا اسے جلال آباد پہنچا دیا۔ مگر عجیب بات کہ خود آرام طلب مجھے بار بار جیتی کی دعوت دیتا جو غریب ان راستوں پر رات دن پیدل سفر کو عار کی بجائے ثواب سمجھ کر خدا کا شکر کرتا تھا۔ اس کے چند دن بعد ایک مفرور جو شاہ صاحب کہلاتے تھے۔ جعلی نوٹوں کے سلسلے میں مفرور ہو کر چمرکنڈ پہنچا دیے گئے تھے انہیں ان کی منزل مقصود تک پہنچایا۔ کابل میں اس نے بہت عزت پائی۔

ایک ترک شخصیت :-

انہی دنوں ایک عجیب تماشا دیکھا۔ جلال آباد سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب جو جنڈیالہ ضلع امرتسر کے ایک نوجوان تھے کئی دفعہ مجھے مدعو کر چکے تھے کہ آپ میرے پاس قیام کیا کریں۔ اتفاقیہ میں نے خیال کیا کہ سکول گورنرانس سے قریب ہے اور اس دفعہ مجھے کچھ کام گورنرانس میں تھا۔ سوچا کہ دونوں جگہ قریب ہیں۔ چلو اب کے سکول میں قیام کر لوں وہاں پہنچا تو ایک تماشہ دیکھا۔ وہاں ایک ترک صاحب کو دیکھا اس کے گرد چند ایک پرانے مہاجرین جنہیں جلال آباد میں جاگیریں عطا ہوئی تھیں جمع تھے اور اس کی منت سماجت میں مصروف۔ بات یہ تھی کہ ترک صاحب اپنے بیان کے مطابق جب ترکی حرمین شریفین کی محافظت کے فرائض انجام دے رہا تھا تو یہ صاحب بصرہ کے کوتوال تھے پہلی جنگ عظیم کے دوران گرفتار ہو کر پنجاب کی کسی جیل میں مقید تھے وہ کسی طرح فرار ہو کر جلال آباد پہنچ گئے پہنچانے والے انہیں پہنچا تو گئے مگر یہاں انہیں لاوارث چھوڑ کر واپس لوٹ گئے جلال آباد پہنچ کر وہ کسی مہاجر صاحب کے پاس قیام پذیر تھے کہ گورنر نے انہیں طلب کیا اور کہا کہ ہمارے ہاں حاضر ہو کر جواب دو کہ تم بغیر پاسپورٹ ہمارے ملک میں در آئے ہو کیوں نہ تمہیں اسی راستے واپس انڈیا بھیج دیا جائے جس راستے سے تم افغانستان میں داخل ہوئے ہو اس نے حاضری سے انکار کر دیا کہ میں ایک آزاد قوم کا فرد ہوں آپ کو مجھے ذلت سے بحیثیت ملزم پیش ہونے کے لیے مجبور کرنے کا حق نہیں اور نہ آپ مجھے واپسی کے لیے مجبور نہیں کر سکتے۔ لوگ انہیں سکول میں بی اے اور ثالث بالخیر کی حیثیت سے

اس ترک کو حاضری کی ترغیب دے رہے تھے وہ بے چارہ عجیب خیر خواہوں میں اپنے کو گھرا دیکھ کر کبیدہ خاطر ہو رہا تھا اور ان کی منت پر کان نہیں دیتا تھا میں کچھ تو خاموش دیکھتا رہا۔ آخر میں نے مہاجر اکابرین سے عرض کی آپ فرنگی کی غلامی سے نکل آئے مگر غلامی کی خو ابھی نہ چھوٹ سکی۔ آپ مہربانی فرما کر گورنر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی خدمت میں عرض کریں کہ وہ ٹیلی فون پر وزارت خارجہ سے یہ صورت حال بیان کریں اس نام و عہدے کا ایک ترک افسر اپنا ہو کر یہاں پہنچا ہے۔ اس کے متعلق کیا کیا جائے وزارت خارجہ نے ترکی سفیر فخری پاشا سے استفسار کیا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک ہو اور کیا آپ اس کی کیا ضمانت دیتے ہیں۔ ترکی سفیر نے کہا۔ کہ وہ ایک معزز شخصیت کا مالک ہے آپ اسے فوراً با احترام ہمارے پاس پہنچانے کا انتظام کریں۔ یا ہم خود انتظام کر لیتے ہیں۔ وزارت خارجہ نے جواب دیا کہ آپ تکلیف نہ فرمائیں وہ ہمارے معزز مہمان ہیں ہم خود پہنچائے دیتے ہیں۔ یہ سارا کچھ ٹیلی فون پر کوئی پندرہ منٹ میں ہو گیا۔ ابھی لوگ چہ میگوئیاں اور انتظار کر رہے تھے کہ آدھ گھنٹے سے بھی کم عرصہ میں گورنر صاحب خود کار لے کر سکول تشریف فرما ہوئے اور ایک معزز مہمان کی حیثیت سے انہیں کار میں بٹھا کر لے گئے۔

ہندو نوجوان کی گرفتاری:۔

اگلے دن میں کسی کام سے بازار میں نکلا تو مجھے معلوم ہوا کہ ایک ہندوستانی ہندو کو بغرض قرار یہاں لایا گیا ہے۔ وہ بہت روتا ہے مگر اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے وہ بغیر پاسپورٹ کے کابل سے پرے گرفتار ہوا ہے۔ میں نے دیکھا تو کوتوالی میں وہی مہاشے جکڑے پڑے ہیں (جنہیں چند دن پہلے میں نے کابل روانہ کیا تھا) وہ مجھے میں انہیں پہچان گیا۔ آپ خیر سے کابل میں نچلے نہ رہ سکے اور مولانا یعقوب صاحب کے انتظام کا انتظار کیے بغیر کسی ہندو کے ساتھ جو روس کی سرحد کے قریب کاروبار کرتا تھا روانہ ہو گئے اور گرفتار کر لیے گئے۔ کابل سے اس حکم کے تحت کہ انہیں سرحد پار کر دیا جائے زیر حراست واپس آ رہے تھے میں نے اسے یہ کہا کہ اگر تمہیں پوچھا جائے کہ تمہیں

عبدالکریم کے حوالے کر دیا جائے تو تمہیں کوئی عذر نہیں کرنا ہوگا۔ اس کے بعد میں امورِ خارجہ سے ملا اور اسے کہا کہ یہ ہمارا اہم خیال اور ایک انقلابی فرنگی دشمن ہے اسے میرے حوالے کر دیں اسے ہمراہ لے جاؤں گا۔ چنانچہ اس نے مجھ سے ایک تحریر لے کر کہ میں اسے سرحد پار کر دوں گا میرے حوالے کر دیا اور میں اسے واپس چمرکنڈ لے آیا۔

ہرنام سنگھ :۔

کچھ دنوں بعد ایک سکھ ہرنام سنگھ چمرکنڈ میں وارد ہوا۔ یہ کوماگاٹا ماری جہاز سے ماخوذ کیا گیا تھا اور اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ جالندھر جیل میں مقید تھا۔ حضرت مولانا فضل الٰہی صاحب بھی ان دنوں جالندھر جیل میں مقید تھے۔ مولانا خود تو قید ہی میں رہے۔ مگر ان چاروں کے فرار کا انتظام کر دیا پھر جیل کے اندر رہتے انہیں لشکر میں پہنچانے کا انتظام کر دیا۔ چنانچہ ہرنام سنگھ انہیں چاروں میں سے ایک تھا۔ یہ لوگ کچھ عرصہ لشکر میں ہی رہے تھے۔

جتنا عرصہ میں لشکر میں موجود تھا۔ مہمانداری بھی کسی قدر میرے ذمے ہوتی مہمانداری کھانے پینے اور آرام کے علاوہ اس کی دلجوئی کے لیے اس کے ساتھ گفتگو کا بھی اکثر موقعہ ملتا۔ بعض دفعہ ایسا موقعہ خود مہیا کرنا ہوتا۔ اس طرح ہرنام سنگھ سے گفتگو کا کافی موقعہ ملا۔ کچھ ہندی سیاست پر اور فرنگی سیاست کانگریس، مسلم لیگ، تحریک اسلامی پر مگر ہرنام سنگھ مجھے زیادہ سے زیادہ اپنے لشکر سے متاثر ہونے کا ذکر کرتا۔ لشکر کا ڈسپلن ایمانداری، جرأت، بہادری وہ مولانا فضل الٰہی صاحب (مرحوم و مغفور) جو اس وقت امیر لشکر تھے) کی جیل میں ان پر سختیوں اور تکلیفوں پر صبر و برداشت اور ان کے اس احسان کہ انہوں نے کس حکمت عملی سے انہیں جیل سے فراری اور لشکر میں پہنچانے کا التزام فرمایا ان بہت باتوں میں سے صرف ایک واقعہ ہرنام سنگھ کی زبانی نقل کرتا ہوں۔ پہلی جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی اور مجاہدین کا لشکر فرنگی پر حملے کے لیے پر تول رہا تھا کہ ایک لڑکا جس کی عمر تقریباً نو یا دس سال ہو گی ہرنام سنگھ سے آمنا سامنا ہو گیا۔ ہرنام سنگھ نے بیان کیا کہ

یں نے اس سے کہا کہ اب تو مزے ہوں گے ہندوستان آزاد ہو جائے گا اور آپ لوگ اپنے وطن جاکر آرام کی زندگی بسر کر سکو گے۔ وہ بولا ہم لوگوں کو آرام سے کیا واسطہ انگریزدل نے جتنے سال ہمارے ملک کی خدمت کی ہے یہ ہم پر قرض ہے۔ ہمیں کم از کم اتنے سال توان کے وطن پر قابض رہ کران کی خدمت کرنا لازمی ہو گا۔ ہمیں آرام کی ضرورت بھی نہیں ہمارے آرام کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ میں اس بچے کے جذبات معلوم کر کے عش عش کر اٹھا۔

سکھوں کی نفسیات :۔

اس کے چر کنڈ آنے کے متعلق وہی پرانی روایت کی صداقت کا ظہور تھا کہ سکھ کسی کام کے متعلق کرنے کے بعد سوچا کرتے ہیں۔ ان کو مولانا بشیر صاحب کی کوشش سے ایک گردوارے کے لیے لالپورہ جو افغانستان کے علاقے میں دریائے کابل کے کنارے ڈکہ کے بالمقابل جو دریا کے بائیں کنارے واقع ہے کچھ زمین ملی ہوئی تھی اور سکھ اس گوردوارے کو عبادت کی بجائے اسلحہ کے مرکز کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اور گرد سے اسلحہ خرید کر دریا کے راستے پشاور اور اندرون ملک سکھوں کو پہنچاتے اور اس بیوپار کی وجہ سے مالی حالت بھی اچھی تھی۔ افغانستان میں اسلحہ رکھنے کی بھی آزادی تھی ان کے پاس مقامی طور پر اسلحہ وافر موجود رہتا تھا۔ مسلمان ان کی فرنگی دشمنی کی وجہ سے تعرض نہ کرتے تھے مگر وہ سکھ ہی کہاں جو کچھ طاقت رکھتا ہو پھر مظاہرہ نہ کرے۔ چنانچہ انہوں نے طاقت کے زعم میں مسلمانوں کو آنکھیں دکھانا شروع کر دیں۔ شروع میں مسلمان ان کو کمزور ہمسایہ اور غیر مسلم رعایا جانتے ہوئے درگذر سے کام لیتے رہے۔ مگر سکھ اپنی نطرتی لینگی کی وجہ سے کچھ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے اور مسلمانوں کے اغماض کو کمزوری پر محمول کر کے زیادہ اچھلنے لگے۔ اب مسلمان سنجیدگی سے معاملہ پر غور کرنے کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک بار سکھوں کو فہمیدگی کی دعوت بھی دی مگر سکھ اور سنجیدگی کا بیر ہے

مجبور ہوئے کہ ہم نے گھمنڈ میں آکر خواہ مخواہ شوریدہ سری دکھائی اور ذلیل ہو گئے۔ پہلے مانزل والی خفا اب قائم ہوتی ان کے بس کا روگ نہ معلوم ہوئی تب یہ سوچا کہ مولانا البشیر صاحب کی وساطت سے سابقہ فضا بحال کر کے ماموں ہولہ ہرنام سنگھ نے کچھ دوسرے انداز سے مجھے ہسٹری سنائی تھی مگر مولانا البشیر صاحب نے مجھے اسی طرح بتایا تھا اور ان کے بیان کردہ مضمون کو میں نے تبدل کر کے تحریر کیا ہے۔

ہرنام سنگھ کو معافی :۔

اگلے دن مولانا صاحب نے مجھے مامور فرمایا کہ تم ہرنام سنگھ کے ساتھ جناب ملاں صاحب جیکتور کی خدمت میں جاؤ اور اسے ان کے سامنے لے جانا اور میری طرف سے میرے سلام کے بعد کہنا کہ مولانا البشیر نے کہا (مولانا صاحب جب بھی اس قسم کا پیغام دیتے تو فرماتے کہنا البشیر نے یوں کہا ہے) یعنی کہ ہرنام سنگھ انگریز کا دشمن ہے اس لیے ہمارا دوست ہے اور یہ عجیب واقعہ ہے کہ جب میں حضرت ملاں صاحب کو مولانا صاحب کا پیغام گوش گذار کیا تو ملاں صاحب نے ہرنام سنگھ کو تھپکی دی اور کہا کہ یہ بات مجھے ہی کہہ دی ہوتی تو اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے جاؤ امن سے رہو۔ ہماری طرف سے امان ہے۔

المجاہد کی مقبولیت :۔

میں اسی وقت چمرکنڈ کے لیے لوٹ پڑا۔ لشکر میں عجیب حالات رونما ہو رہے تھے میری مصروفیت کی حالت یہ تھی کہ اخبار کی کتابت۔ طباعت اور اشاعت کا بار مجھ پر تھا اخبار تاحال سائیکلو سٹائیل پر چھپ کر آرہا تھا۔ اور ہر پرچہ اپنے پہلے پرچوں پر سبقت لے جاتا۔ مقبولیت کی یہ حالت تھی کہ صرف امریکہ میں ۱۰۱ پرچے اور آسٹریلیا میں بھی کچھ پرچے جاتے تھے۔ امریکہ سے ہمیں ایک چٹھی ملی جس میں بہت داد دی گئی تھی۔ اور لکھا تھا کہ گھبرا نامت کہ تمہارا اخبار سائیکلو سٹائیل پر چھپ رہا ہے۔ امریکہ کی آزادی کی

تحریک کا ارگن بھی سائیکلوسٹائل پر چھپ رہا تھا۔ بلکہ اس یاد کو قائم رکھنے کے لیے وہ اخبار اب بھی بدستور سائیکلوسٹائل پر چھپ رہا ہے۔ انگلستان میں لارڈز اور امراء اور وزرا کو بھیجے جاتے تھے اور ہندوستان سے باقاعدہ بحق ملک معظم ضبطی کا سرٹیفکیٹ مرحمت ہو کر آتا تھا۔ جلال آباد اکثر دفعہ مجھے جانا پڑتا اور عبدالرشید صاحب کاتب اتحاد مشرقی اکثر مزے لے لے کر المجاہد کے حوالے سے اپنے اخبار کو زینت دیتے۔ مکین کے دو مکتوب تو خاص طور پر بہت مقبول ہوئے۔ دونوں مضمون یکے بعد دیگرے کچھ اس طرح تھے میں اختصار سے لکھتا ہوں۔

مکتوب مکین ۱:-

آج ہوائی جہاز کی اڑان کے خلاف بطور احتجاج چند گولیاں ہوائی جہاز پر چلائی گئیں۔ جہاز زد میں تھا۔ زخمی ہو گیا اور ہوا باز نے مجبور ہو کر نیچے آتار لیا وہ ہماری حد کے اندر اتر ہے۔ جہاز پر قبضہ کر کے دو انگریز پائلٹ زندہ گرفتار کیے جا چکے ہیں قریب تھا کہ وہ خودکشی کی کوشش کرتے مگر ہم نے پھرتی سے انہیں گرفتار کر لیا ہے۔ ہم نے ان ہر دو کو خاطر مدارت سے رکھا ہوا ہے اور مولوی عبدالغنی صاحب جو میٹرک پاس ہیں۔ ان سے گپ شپ بھی کرتے ہیں اور ان کی ضروریات بھی مہیا کر دیتے ہیں۔ ہم ان کی گرفتاری سے کوئی مالی یا مادی فائدہ حاصل نہیں کرنا چاہتے بلکہ ان کو اپنی روایتی مہمانداری اور ان کی مجبوری کو دیکھتے ہوئے انہیں احسان کے ساتھ رہا کر دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ خط میں اور بھی مواد تھا جو اس وقت ذہن سے اتر گیا ہے۔ چنانچہ کچھ دن بعد پائلٹ چھوڑ دیے گئے مگر افسوس ہے کہ ہماری شرافت اور بردباری کے جواب میں کبھی برطانیہ نے ہمارے کسی ماخوذ سے بھی رعایت نہیں کی بلکہ جیسا کہ آگے جا کر اپنے مقام پر ذکر ہو گا کہ ہمارے رفیقوں کے ساتھ نہایت وحشیانہ سلوک روا رکھا جاتا رہا۔

دوسرا مکتوب بکین :-

بعد از سلام مسنون۔

فرنگی نے اس دفعہ ہمیں پوری طرح مٹانے کا پروگرام بنایا تھا۔ جس کی تفصیل یہ ہے ہمیں کسی طرح اس متوقع حملے کی خبر پہلے سے مل گئی تھی۔ پہلی توپ کی گولہ باری سے بکین کو تباہ کر دیا گیا تھا۔ مگر اب ہم دوبارہ مکانات تعمیر کر چکے تھے۔ حملے کی شدت اور طریق کے علم کے بعد ہمارے لیے بجز بستی خالی کر دینے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اس دفعہ ان کا ارادہ فوجی اقدام کر کے اہل بستی کو ختم کر دینے کا تھا۔ بچوں اور عورتوں کو محفوظ مقام پر چھوڑ کر ہم تین سو کر بند پہاڑی پر چڑھ کر مورچہ گیر ہو گئے۔

پہلے دن سکھ فوج حملہ آور ہوئی۔ بستی کو خالی پا کر وہ آگے درے میں بڑھ آئی ہوائی جہاز ہمارے سروں پر منڈلا رہے تھے۔ مگر خدا ہی جانتا ہے کہ وہ ہمیں کیوں نہ دیکھ سکے فوج درے میں بڑھ رہی تھی۔ جب دشمن ہماری زد میں آ گیا تو ہمیں فائر کھولنا ضروری ہو گیا یہ ہم نہیں بتا سکتے کہ وہ ہماری گولیاں تھیں یا کدھر سے تائید غیبی تھی کہ دشمن والوں کی طرح بھن رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بھاگڑ جو شروع ہوئی تو آپ جانتے ہیں کہ سکھ جب پیچھے بھاگتے ہیں تو پھر پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ تھوڑی دیر بعد بے شمار لاشیں درے میں پانی کے اندر اور باہر چھوڑ کر دشمن میدان چھوڑ گیا۔ جاتے وقت انہوں نے اپنی بہادری کا مظاہرہ یوں کیا کہ خالی بستی کو آگ لگا دی اور ایسے غضبناک ہوئے کہ مسجد بھی نہ چھوڑی امام مسجد جو بہت بوڑھا اور نابینا تھا مسجد ہی میں رہ گیا تھا۔ کہ مجھے کوئی کیا کہے گا۔ مسجد کو آگ لگنے کے بعد باہر نکل آیا کہ جان بچا لے۔ بہادر سورماؤں نے اس ضعیف اور ناتواں کو پکڑ کر آگ لگا دی اور اپنی شکست کی ذلت کو اور بھی اجاگر کر دیا۔ ہمیں اطلاع مل گئی تھی کہ اگلے دن گورکھا فوج حملہ کرے گی۔ مقابلہ گو سخت تھا۔ توکل علی اللہ تھوڑی سی مقامی تبدیلی کے ساتھ ہم نے وہی طریقہ برتا۔ الحمد اللہ۔ کل کی طرح دشمن کافی نقصان اٹھا کر پسپا ہو گیا۔ مگر ان غریبوں کے لیے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے اب کیا رہ گیا تھا۔ یعنی کل سکھ جلا گئے تھے

اس لیے انتقام کی آگ سینوں میں لے کر کیمپ میں پناہ گزین ہو گئے۔ ہمیں اطلاع مل چکی تھی کہ کل پٹھان حملہ کریں گے۔ پٹھانوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ہم بھی پٹھان وہ بھی پٹھان لڑے گا لڑانا ہے۔ ہم ماریں گا۔ ہمارے پاس اللہ کے توکل کے سوا کیا رکھا ہے۔ کچھ تبدیلی کے ساتھ ہم سابقہ طریق پر مجبور تھے۔ چنانچہ حسب سابق ہم نے ان مہمانوں کا خیر مقدم حسب سابق خوش اسلوبی سے کیا۔ الحمدللہ۔ نتیجہ وہی رہا اور دشمن خائب و خاسر واپسی پر مجبور ہو گئے۔

کیا معلوم حکومت کو کیا سبز باغ دکھا کر ان حملوں کی منظوری حاصل کی گئی۔ امید تو نہیں کہ آئندہ جلد دشمن کسی غلطی کا ارتکاب کرے اور ممکن ہے کہ حکومت بہ سبب ندامت اپنے اس نقصان کا اعلان نہ کر سکے۔ ہم اللہ کے فضل سے جان ہتھیلی پر رکھے جان سپاری کے لیے تیار ہیں۔ اللہ ہمارا حافظ و ناصر ہے۔ دشمن اگر قوی است نگہباں۔

قارئین اندازہ کر سکتے ہیں۔ دشمن اس خیال میں ہے کہ مولانا محافظ ہیں نہیں جانتے کہ محافظ کا خدا حافظ ہے۔ غالباً یہ حملے ان دو انگریز پالیٹکس کو بار ادت چھوڑ دینے کے عوض میں کیے گئے ہیں۔ جس کو اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ والسلام۔

لشکر میں انتشار :-

اخبار کی مقبولیت میں اضافہ ہی اضافہ ہو رہا تھا فرنگی کا دشمن بہت بے قراری سے المجاہد کا منتظر رہتا۔ اخبار کی اس ہمہ ہمی کے ساتھ لشکر میں انتشار کی سی کیفیت تھی۔ مولانا بشیر صبح قرآن مجید کا درس دیتے تھے بیعت کا معاملہ معلق تھا۔ دونوں حضرات اپنے اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم تھے۔ چند لوگ یہ تجویز سوچ رہے تھے کہ ہندوستان میں لشکر کے کوائف کی اطلاع کر کے وہاں سے کسی صاحب کو امارت کے لیے یا فیصلہ کرنے کے لیے دعوت دی جائے۔ ادھر کئی صاحب ایسے بھی تھے کہ جماعت میں کوئی ہنگامہ برپا ہو اور نتیجۃً اسمست کا سبق دہرایا جائے۔ مگر جماعت اپنے معاملے میں کسی ناخوشگواری کے لیے تیار نہ تھی۔ انہی دنوں کابل کے اخبار خبر لائے کہ مولانا احمد علی صاحب واپس ہندوستان

لوٹ رہے ہیں۔ اس خبر کو پڑھ کر جماعت کے مشیروں میں گفتگو ہوئی اور فیصلہ ہوا کہ مولانا کو ہم کنڈ لایا جائے ممکن ہے کہ خدا اس طرح انتشار دور کر دے۔ چنانچہ مجھے مولانا کو لینے کے لیے جلال آباد جانے کا حکم ہوا اور یہ حکم خود امیر صاحب نے دیا۔ اس سے پہلے بھی باوجود انتشار کے ہر کام امیر صاحب کے حکم سے ہوتا تھا اور ہر سفر آپ کے حکم ہی سے کیا جاتا میں بھاگ دوڑ کر دو دن میں جلال آباد پہنچا۔ تو یہ خبر سنی کہ مولانا کل شام جلال آباد پہنچے تھے اور آج صبح ہی وہ یہاں سے ٹانگہ پر سوار چلے گئے اور غالباً آج شام وہ سرحد عبور کرلیں گے۔ میں ناکام واپس لوٹا تو بعض مقتدر اصحاب نے فیصلہ کیا کہ مولانا فضل الٰہی صاحب سے بیت المال لے لیا جائے اور اس کا انتظام مولوی یٰسین صاحب کے سپرد کر دیا جائے اور لشکر ان دونوں بزرگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دے۔ تا آنکہ ہر دو اصحاب آپس میں فیصلہ اور صلح صفائی کرلیں۔ لشکر مولوی یٰسین صاحب کے ماتحت رہے۔ یہ فیصلہ دو ہی دن رہا کہ بعض اصحاب اپنے فیصلے پر نادم ہوئے۔ تیسرے دن صبح بعض لوگ خصوصاً نادل کے حضرات تیار ہونے لگے اور کچھ اور اصحاب نادمین میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ اگلی صبح نماز فجر کے بعد (امامت حضرت امیر ہی کرتے تھے) امیر صاحب کے پاؤں پر گر پڑے اور سب کی طرف سے معافی مانگی۔ یٰسین صاحب نے بیت المال واپس کر دیا اور سرداری سے دستکش ہو گئے ابھی بیعت وغیرہ اور کی نہیں ہوئی تھی اس وقت مولانا بشیر کے علاوہ سب مہاجروں نے بیعت کی تجدید کی۔ اس بظاہر چپقلش اور باطنی روٹھ یا احتجاج کا یہ نتیجہ ہوا کہ جماعت کا انتشار کم ہو گیا۔ امیر صاحب نے اپنا موقف بدل لیا کہ وہ بیعت کے اصرار سے ٹل گئے اور مولانا نے بغیر بیعت کے ہر حکم کی عملاً تعمیل کرنا شروع کر دی۔ گو عملاً پہلے بھی مولانا جماعت کی بہبودی کو کسی حال نظر انداز نہ کرتے تھے مگر اب عملاً مولانا کو امیر صاحب ہر اہم مشورہ میں شامل کرنے لگے۔ بلکہ دونوں صاحب دوستوں کی طرح رہنے لگے اور یہ اس تحریک بظاہر چپقلش کا خود بخود رد عمل ہوا۔ جماعت کا یہ نظم مستعدی سے ہونے لگا۔ مجھے اخبار کے فرائض کی وجہ سے رات کافی وقت جاگنا ہوتا مولانا بشیر صاحب کا خط لشکر میں میرے سوا اور کوئی مشکل سے پڑھ سکتا تھا۔ اس لیے

اخبار کی کتابت لازماً مجھے کرنا ہوتی تھی اور ڈاک شاہاں جو عموماً مولانا بشیر مرتب فرماتے تھے عموماً مارات ہی کو کاپی کرنا تھا۔

رمضان کے معمولات :-

رمضان شروع ہو گیا اور اپنی بے بہا برکتوں کے ساتھ اتفاق اور اطمینان بھی ساتھ لے آیا۔ بڑے اطمینان سے گذر رہا تھا۔ آٹھ یا نو رمضان المبارک کو میں ایک مجاہد کو ساتھ لے کر میاں ملی علاقہ باجوڑ میں ایک شہر سے کپڑا خریدنے لگا۔ جو عید کے لیے مجاہدوں میں تقسیم کیا گیا۔ اس دفعہ بہت دیر کے بعد مولانا بشیر صاحب کو آرام سے رمضان المبارک کی سعادتیں حاصل کرنے کا موقعہ ملا تھا یوں تو ہر مجاہد ان سعادتوں سے صفدرمہ بھر مستفید ہونے کی کوشش میں تھا۔ سبحان اللہ کیسا پاک تھا وہ ماحول۔ بیس تراویح میں دو قرآن پاک سنے جا رہے تھے۔ آٹھ تراویح میں حضرت امیر مولانا فضل الٰہی صاحب اپنا قرآن ختم کر رہے تھے اور بارہ تراویح میں ایک مقامی باجوڑی حافظ اپنا قرآن سنا رہے تھے یوں تو لشکر میں بہت سے مجاہد حافظ قرآن تھے۔ مگر باجوڑی حافظ ہاڈا صاحبؒ کے وقت سے رواج کے مطابق ہر سال آتے تھے۔ بیس تراویح ختم کرنے کے بعد بھی اکثر مجاہد اپنی تشنگی کی تسکین کے لیے کسی حافظ کو پکڑ لیتے دو تین چار پارے مزید سنتے۔ بعض مجاہدین سحری تک عبادت میں مصروف رہتے۔ پچھلا عشرہ بعض مجاہد اور حضرت امیر اور مولانا بشیر اعتکاف میں بیٹھے مسجد کے دو کمرے آگے پیچھے تھے ہر دو حضرات مسجد کی جنوبی دیوار کے ساتھ دونوں کمروں کھڑکیوں کے ساتھ منسلک تھے تاکہ پردے میں بیٹھ کر تلاوت جاری رکھ سکیں۔ ۲۲ رمضان ہم لوگ صحن میں نماز عصر سے فارغ ہو کر دعا مانگ رہے تھے کہ نادر شاہ صاحب جو لشکر کے ایک مجاہد رکن تھے اور ایک بیوہ مقامی خاتون سے نکاح کر کے گنڈ میں رہائش پذیر تھے۔ دو افغان حکومت سے عطا شدہ حصہ زمین پر کاشت کر کے گذر بسر کرتے تھے اور کبھی کبھی گنڈ میں زمینداری اور فرائض جہاد بجا لاتے تھے۔ وارد ہوئے اور علیک سلیک سے فارغ ہو کر ہر دو حضرات مولانا فضل الٰہی

صاحب اور مولانا بشیر صاحب کو ساتھ لے کر مسجد کے اندر چلے گئے اور شام سے ذرا پہلے وہ واپس ہو گئے۔ پھر ان کو نماز عشاء میں دیکھا گیا۔ اگلے دن وہ واپس ہو گئے۔ حالانکہ وہ عام طور پر جب بھی چمرکنڈ آتے تو کئی کئی روز وہ چمرکنڈ ہی ٹھہرتے اور لشکر کو قواعد پریڈ کرا تے یہ ڈیوٹی اکثر وہی بجا لاتے تھے۔ قواعد عربی زبان میں ہوتی تھی۔ کسی موزوں موقعہ پر قواعد کے متعلق کچھ عرض کروں گا۔

عید کا اہتمام :۔

چمرکنڈ میں رواج تھا کہ عیدین کے موقعہ پر مقامی بستی چمرکنڈ بالا کے تمام مردوں کی دعوت کی جاتی تھی۔ اور عام طور پر عید الفطر کے موقعہ پر بھی پلاؤ سے تواضع کی جاتی تھی۔ اس عید پر مولانا بشیر کی موجودگی کے باعث رونق بہت زیادہ تھی۔ خطبہ عید بھی مولانا موصوف نے اپنے خاص رنگ میں بیان فرمایا۔ مجاہد اور مقامی بہت متاثر ہوئے۔ کیونکہ خطبہ پشتو میں دیا گیا تھا اور یہ مقامی لوگوں کی زیادہ دلچسپی کا باعث ہوا۔ عید اپنی برکتیں سعادتیں بکھیرتی گذر گئی۔

ایک بے چینی :۔

عید سے اگلے دن مجھے جلال آباد اخبار کے لیے سامان کے سلسلے میں جانے کا حکم ہوا جب میں جلال آباد پہنچا تو مجاہدین سے دلچسپی اور ہمدردی رکھنے والے احباب نے ذکر کیا کہ عبداللہ چمرکنڈ پہنچا تھا؟ میرے انکار پر وہ بولے کہ وہ انیسویں یا بیسویں رمضان کو یہاں آیا تھا۔ اس کے پاس تین سو پونڈ اور دو پستول تھے۔ وہ ہمیں دکھاتا تھا اور اگلے دن وہ چمرکنڈ روانہ ہو گیا تھا۔ چونکہ میرے علم میں وہ چمرکنڈ نہیں پہنچا تھا اس لیے میں

ل یہ واقعہ ہے کہ ایک نوجوان مجاہد عبدالستار انگریزی علاقہ میں گرفتار ہو گیا۔ اس کے پاس مولانا کا خط تھا جو پڑھا نہ جا سکا۔ یہ نوجوان آوارہ گردی کے بہانے دو سال سزا پا گیا۔

نے اس خبر سے اچھا تاثر نہیں لیا (یہ وہی عبداللہ تھا جو وزیرستان سے آکر مولانا عبیداللہ صاحب سندھی کی خدمت میں رہ گیا تھا) اور جلدی اپنا کام ختم کرکے چمرکنڈ پہنچا۔ میں نے احتیاطاً اس واقعہ کا ذکر صرف مولانا سے کیا۔ انھوں نے فرمایا وہ یہاں نہیں آیا۔ مجھے فکر ہوا کہ وہ چمرکنڈ کے پیسے آیا۔ اس کے پاس اتنے پونڈ اور دو پستول تھے۔ وہ ضرور کسی گھات میں ہوگا۔ اور وہ کافی عرصہ لشکر میں رہ کر لشکر کے ہر مقام اور حالات سے باخبر ہے۔ کہیں وہ کچھ نقصان نہ پہنچادے۔ میرے یہ خیالات میری سخت بے چینی کا باعث بنے تھے۔ اس روز میں نے مولانا سے اپنی بے چینی کا اظہار کیا اور شام ہوتے تک میری بے چینی انتہا کو پہنچ گئی۔ مگر میں اس راز میں کسی اور کو شریک بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اور مولانا تھے کہ ہر دفعہ مجھے یہ کہہ کر ٹال دیتے کہ تم خواہ مخواہ معمولی بات کو اہمیت دے رہے ہو۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا اور عشاء کے بعد میں نے مولانا سے عرض کیا کہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں ارد گرد گھوم پھر کر اس کا سراغ نکالوں اور اس خطرے کا سدباب کروں جو میرے نزدیک ایک بھیانک خطرہ ہے۔ اگرچہ آپ اسے اہمیت نہیں دیتے۔ مگر جس وقت اس سے پردہ اٹھے گا آپ اس کی اہمیت کو تسلیم فرمالیں گے۔ مولانا نے فرمایا عبدالکریم مجھے خطرہ ہے کہ تمہاری بے کلی کہیں کوئی گل نہ کھلادے۔ اس لیے تمہیں بتانا ہی پڑا۔ فرمایا تمہیں یاد ہے کہ ۲۳ رمضان کو نادر شاہ صاحب آئے تھے اور وہ مجھے اور امیر صاحب کو بلا کر اندر لے گیا تھا۔ اس نے اندر جاکر ایک فتویٰ پوچھا کہ ایک ایسے شخص کیلئے کیا حکم ہے جو لبلی پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی بندوق بالکل سیدھی کر چکا ہو اور اس وقت کا ہی منتظر ہو کہ شکار اس کی زد میں آئے اور فائر کرکے اپنا ارادہ کرے۔ مولانا فضل الہٰی صاحب نے فرمایا۔ قتل الموذی قبل الایذا۔ شاہ صاحب میری طرف متوجہ ہوئے۔ میں نے کہا بھائی میرے سامنے حضرت علیؓ کی مثال موجود ہے جب کہ آپ کے قاتل کے ارادہ مصمم کا یقین بلکہ اظہار بھی ہو چکا تو آپ کے مشیروں نے آپ کو مجبور کیا کہ ابن ملجم آپ کے قتل کے ارادے کا اظہار بھی کر چکا ہے تو آپ اس کی گرفتاری کا حکم صادر فرمائیں۔ آپ نے فرمایا جرم سے پہلے گرفتاری کی اجازت اسلام نہیں دیتا اس لیے میں اس کی گرفتاری

کو جائز نہیں سمجھتا۔

قتل کی سازش :۔

شاہ صاحب موصوف نے بتایا کہ کابل سے مولانا نے عبداللہ کو بشیر صاحب کے قتل کے لیے بھیجا تھا۔ اس کو تین سو پونڈ پیشگی دیے ہیں۔ اور پانچ سو بعد از قتل وعدہ کیا ہے۔ دو پستول اس کو اس لیے دیے گئے ہیں کہ وہ اپنے ساتھ کسی کو معاونت کے لیے ملائے اور دوسرا پستول معاون کو دے کر اسے کہا گیا ہے کہ اول تو مجھے (شاہ صاحب) معاونت کی دعوت دے اور اگر میں آمادہ نہ ہو سکوں تو وہ سید اشاہ میں پارٹی پہلے سے انہی اغراض کے لیے بٹھا رکھی ہے اور ساتھی میں ابراہیم جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔ اور جو اکیلے دشت یا میر عبور کر چکا ہے وہ بھی سید اشاہ میں ہے۔ اس پارٹی کے اراکین کی طرف فرداً فرداً عبداللہ کی اعانت کے لیے چٹھیاں اس کے ہاتھ بھیجی ہیں۔ شاہ صاحب نے بتایا کہ وہ حسب ہدایت پہلے میرے پاس آیا اور مجھے مولانا کی طرف سے پیغام دے کر ترغیب دی کہ میں اس کی اعانت کروں انہوں نے بتایا کہ پیغام سن کر مجھے نہایت رنج ہوا کہ میں اگر مولانا کا ادب کرتا رہا ہوں اور میرے دل میں ان کی عزت اور وقار تھا تو اس کا مطلب انہوں نے کیونکر اخذ کر لیا کہ میں ان کی خاطر اتنی ذلیل حرکت کر کے اپنی عاقبت برباد کر لوں گا۔ خدا نے مجھے شہ زوری بخشی ہے تو اس کا مصرف کفر کے خلاف ہے۔ یہ میرے ساتھ کیا مذاق کیا گیا ممکن تھا کہ میں کوئی اقدام وہیں کر بیٹھتا یا غصے میں اسے دھتکار کر نکال دیتا مگر اللہ تعالےٰ نے بر وقت مجھے سوچنے کی طرف راغب کر دیا۔ سوچا اگر میں اسے یہیں ٹھکانے لگاتا ہوں تو افغان حکومت اور عوام کو ہمارے بڑوں کے متعلق کیا گمان گذرے گا اور ان کی کتنی خفتجی ہو گی پھر دوسرا خیال اسے جھڑک دینے کے متعلق آیا تو چٹھیاں اس کے پاس تھیں۔ انہوں نے مجھے اس ارادے سے باز رکھا کہ مبادہ مجھ سے مایوس ہو کر یہ ان کے پاس جائے گا اور وہ ضرور اس کی معاونت کریں گے۔ کیونکہ اس کا مشن یہی تھا اس لیے میں نے اسے دھوکے میں رکھنے کا فیصلہ کر لیا اور اسے کہا چلو میں

تیار ہوں وہ میرے ساتھ آیا میں اسے تھوڑی دور پہاڑ پر چھوڑ آیا ہوں۔ اسے کہہ آیا ہوں کہ میں پوزیشن دیکھ آؤں کیونکہ لشکر مجھے شبہ نہیں خیال کر سکتا۔ پھر میں آ کر تمہیں ساتھ لے چلوں گا۔ اب وہ میرا منتظر ہے۔ مجھے جلدی واپس جا کر اس کا کام تمام کرنے کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ وہ ہمارے پاس سے اٹھے اور مسجد سے نکل کر لشکر سے ایک تلوار لی اُسے کمبل میں چھپا لیا اور چلے گئے اور شام کے قریب اُسے قتل کر آئے میرے دل سے یہ کیفیت معلوم کر کے ایک بوجھ اتر چکا تھا۔ مگر اس کی تفصیل معلوم کرنے کا مجھے خیال پیدا ہو گیا اور میں منتظر رہا کہ کبھی خود شاہ صاحب کی زبانی معلوم کروں گا۔

واقعہ کی تفصیلات :۔

میں ایک موقعہ پہ کابل جا رہا تھا کہ مجھے شاہ صاحب کے ہاں ایک رات قیام کا موقعہ مل گیا۔ میں نے شاہ صاحب سے اس راز سے پردہ اٹھانے کی اپیل کی تو وہ حیران ہو گئے کہ تمہیں یہ راز کیسے معلوم ہو گیا۔ اس راز کا سوائے دو تین اصحاب کے کسی کو علم نہیں تھا۔ اور عبداللہ کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے انہیں اس راز میں لیا گیا تھا۔ میں نے یہ واقعہ جس طرح مجھے علم ہوا تھا من و عن بیان کر دیا۔ جب شاہ صاحب کو علم ہو گیا کہ اب مجھ سے اخفاء بے سود ہے۔ انہوں نے مولانا کے بیان کی تصدیق کی بلکہ مزید بیان کیا کہ خدا کا شکر ہے کہ مجھے لالچ سے بچ کر ایمان کی سلامتی بخشی۔ وہ لیے کہ میں پہلے بھی بشیر صاحب کی بہت عزت کرتا تھا۔ مگر اُن کے استدلال اور ان کے خدا پر توکل اور اسلام کے احکام پر عمل اور استقلال کو دیکھ کر میرے دل میں اُن کی عزت اور احترام میں بہت اضافہ ہو گیا اور سازش کنندوں کی جتنی عزت میرے دل میں تھی اس سے زیادہ نفرت پیدا ہو گئی اور عبداللہؓ کی نادانی اور حرام موت اور اپنے ہاتھ اس کے خون سے آلودہ کرنے کی مجبوری سے بہت

سلہ عبداللہ مجاہدین کے لشکر میں شاہ صاحب کو چھوڑ کر سب سے شہ زور تھا۔

پریشان ہوا۔ مگر مجھے اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ سوجھائی نہ دیا۔ بادل خواستہ مجھے اپنے ایک طاقت ور بازو کو اپنے ہاتھ سے قطع کرنا پڑا۔ وہ وقت میری زندگی میں بہت ہی تکلیف دہ تھا۔ مجبوراً مجھے ایک بہت کڑوا گھونٹ نوش کرنا پڑا۔ شاہ صاحب بیان کرتے ہوئے جذبات کی تیز رو میں بہہ رہے تھے۔ کہنے لگے۔ جب میں تلوار لے کر عبداللہ کے قتل کیے جا رہا تھا مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسا میں خودکشی کے لیے جا رہا ہوں۔ اور جب میں عبداللہ کے پاس پہنچا ہوں اس نے مجھ سے سوال کیا کہ موقع دیکھ آئے ہو اور میں نے اس کے جواب میں اس کی گردن پر تلوار مارتے ہوئے کہا۔ ہاں کم بخت موقعہ دیکھ آیا ہوں۔ کوئی کافر میرے مقابلے پر ہوتا تو اس کی گردن اڑ کر دور جا گرتی۔ مگر میرا ہاتھ اوچھا پڑ گیا۔ پھر بھی زخم کاری تھا۔ عبداللہ کا ہاتھ زخم کھا کر معاً جیب کی طرف بڑھا میں نے اس پر تلوار کا دوسرا وار کرنا مناسب نہ جانا۔ بلکہ اس کو ایک لات ماری اور وہ بیٹھا ہوا گر پڑا۔ میں نے یقین کر کے کہ اب اس کا جانبر ہونا ناممکن ہے۔ لشکر کی طرف لوٹ جانا مناسب سمجھا اور وہاں جا کر ہر دو حضرات کو کیفیت بیان کر دی اور کہا کہ اب اس کی لاش کو ٹھکانے لگانے کا انتظام کر لیں۔ میری طبیعت پریشان اور ناساز ہے۔ چنانچہ لشکر سے بھائی امیر صاحب کے معتقدین اور رازداروں کو بھیجا گیا اور لاش کو فلاں مکان کے اندر جو ان دنوں خالی تھا فلاں مقام پر دبا دی۔ میں نے کہا اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی لاش میری چارپائی کے نیچے دفن تھی کیونکہ جلال آباد سے واپسی کے بعد میں اس مکان میں تبدیل ہو کر آ گیا تھا اور میرے جلال آباد آنے کے بعد میرے گھر والوں کو وہاں سے نکال کر جلال آباد بھیج دیا گیا تھا۔ شاہ صاحب کا بیان تھا کہ قتل کے وقت ایسی بے چینی تھی کہ لاش کی تلاشی بھی نہ لی جا سکی تھی اور جب لاش وہاں سے نکال کر اس کی جیبوں کو دیکھا تو وہ دونوں پستول اور تین سو پونڈ اور تمام خطوط برآمد ہوئے۔ اللہ اکبر۔

باب چہارم
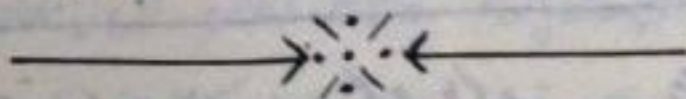
حافظ اسحٰق کے کارنامے

اسحٰق کی منافقت :۔

پیچھے ایک مقام پر حافظ کا ذکر مجمل طور پر آ چکا ہے۔ وہ میرے سفر کیمپ وزیرستان کے دوران لشکر سے فرار ہو چکا تھا۔ اس شخص نے لشکر کو کافی نقصان پہنچایا تھا۔ اس لیے آپ ایک قابل ذکر شخصیت کے اہل ثابت ہوئے، آپ چمرکنڈ میں بیٹھ کر اپنا مشن درستی کے پیرائے میں انجام پذیر کر رہے تھے۔ لشکر میں مولانا فضل الٰہی صاحب پر اپنے دجل کے باعث حاوی تھے۔ یہ شخص اندرون ملک انصار سے بہت واقفیت رکھتا تھا اور مولانا صاحب موصوف اس کی اس حیثیت سے واقف تھے اور وہ اسی بنا پر امیر صاحب پر حاوی تھا کہ وہ ہندوستان کے اندر چمرکنڈ کے لیے بہت مفید کام انجام دے سکتا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اگر وہ منافقت اور دشمنی نہ کرتا تو بہت مفید ثابت ہوتا۔ اس کی منافقانہ روش نے امیر صاحب کو دھوکے میں رکھا اور چمرکنڈ لشکر میں بددلی پھیلانے کو اس کی لشکر سے ہمدردی اور اخلاص تصور کر لیا بے اعتبار آدمی بے حد نقصان کا باعث ہوتا ہے جبکہ اعتبار جمانے کی غرض ہی نقصان پہنچانا ہو۔ اس نے امیر صاحب کو یہ یقین بھی دلایا تھا کہ ہندوستان میں فلاں فلاں مقام کے انصار حضرات نے امیر نعمت اللہ کی روش کے باعث اپنا ہاتھ امداد سے روک رکھا ہے اور وہ تمام رقم جو تقریباً کئی لاکھ ہو گی میں چمرکنڈ لا حاضر کروں گا۔

پہلا شکار :۔

اس کا پہلا شکار بھائی عبدالرحمٰن اور بھائی سراج دین ہوئے۔ بھائی عبدالرحمان

امیر صاحب کا بہت معتمد قاصد تھا جو سارے پنجاب اور یوپی کے اکثر مقامات سے زر امداد حاصل کر کے لشکر میں لاتا تھا اور سراج دین بھی آہستہ آہستہ کام سے واقف ہو رہا تھا چنانچہ امیر صاحب کو بے بس اور بے دست دپا کرنے کے لیے انہی دو صاحبوں کو شکار کیا۔ وہ ان کو حافظ عبد الغفور مرحوم و مغفور کے پاس لے گیا۔ حافظ صاحب موصوف نہایت مخلص تھے اور امیر امت کی روش کے شاکی ہونے کی وجہ سے چمر کنڈ کے ہمدرد تھے اور مولانا عبد الکریم صاحب قنوجی کی زندگی اور چمر کنڈ میں موجودگی کے دوران ایک دفعہ چند دن چمر کنڈ میں مقیم رہے تھے۔ انہوں نے پہلی قسط سولہ ہزار روپیہ دیا تھا جو عبد الرحمٰن کے پاس تھا حافظ اسحٰق کا تعلق اب براہ راست برطانیہ کے محکمہ جاسوسی سے ہو چکا تھا اور وہ لشکر کی بجائے اپنا مستقبل برطانیہ کو سونپ چکا تھا اسی تعلق کی بنا پر وہ یہ سب کھیل کھیل رہا تھا راولپنڈی سے آگے نکل کر اس نے عبد الرحمٰن اور سراج الدین کو خبردار کر دیا کہ ہم خطرے میں ہیں اور یہ لوگ گاڑی میں بیٹھے چند بظاہر مسافر ہیں اور در پردہ اس کے فرنگی کے جاسوس ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میں نے ان کی حرکات کا بغور جائزہ لیا ہے کہ یہ پشاور سے پرے ہی ہمیں گرفتار کر لیں گے۔ ان کا نشانہ خاص کر تم دونوں ہو یہ مجھے فی الحال اپنا ساتھی نہیں سمجھتے اس لیے بہتر ہے کہ اس سے قبل کہ تم بمعہ روپے کے گرفتار کر لیے جاؤ۔ روپیہ مجھے پکڑا دو۔ تاکہ میں اسے چمر کنڈ پہنچا دوں۔ تم ان سے اپنی عقل کے مطابق نمٹ لینا۔ اور جب معلوم ہوا کہ ہم گھر چکے ہیں اور فرار کا راستہ ممکن نہیں۔ انہوں نے کسی کو خبر ہونے سے پہلے نہایت مخفی طریق سے روپیہ حافظ کو دے دیا۔ اور وہ روپیہ قبضہ میں لیتے ہی کھسک گیا اور اپنے ساتھیوں کو اشارہ کر گیا اور انہوں نے انہیں گرفتار کر لیا۔ روپیہ ٹھکانے لگا کر حافظ بہت تیز رفتاری سے اپنے دوسرے شکار کے لیے چمر کنڈ پہنچا۔ چمر کنڈ پہنچ کر ایک عجیب قصہ گھڑ سنایا کہ بھائی عبد الرحمٰن اور سراج دین گرفتار ہو گئے ہیں اور میں حاجی طلا محمد صاحب بازار قصہ خوانی والے جن کے پاس عموماً مجاہد ٹھہرا کرتے تھے اور راقم الحروف بھی آتے جاتے دونوں یار عبد الرحمٰن اور سراج دین صاحبان کے ہمراہ اسی کے پاس ٹھہرا تھا ان کے پاس سے رقعہ لے کر سرحد عبور

کرنے میں بمشکل کامیاب ہوا ہوں۔ حافظ اسحق کے جمرلنڈ پہنچنے کے بعد لشکر میں بہت بیمگی پھیلی اور بھائی لوگوں کو بہت غم ہوا۔ مولانا بشیر ان دنوں کابل گئے ہوئے تھے۔

محضر نامہ کی واپسی:۔

امیر صاحب نے از خود یا اپنے مشیروں سے مشورہ کرکے آزاد علاقہ کے ملوک وخوانین سے مہریں لگوا کر ایک محضر نامہ تیار کرایا کہ عبدالرحمٰن اور سراج دین ہمارے مہمان ہیں انہیں رہا کردیا جائے ورنہ ہماری ناراضگی کا باعث ہوگا۔ اور برطانیہ کو یہ سودا مہنگا پڑے گا۔ مولانا اقدام کرلینے کے بعد معلوم نہیں کیوں مشورہ کرلینے کا خیال کرتے تھے اور جب یہ محضر ہر طرح مکمل ہوگیا تو مولانا نے مجھے دکھایا۔ میں حیران رہ گیا کہ یہ عجیب ہمدردی ہے اور میری سمجھ میں اس کا ردعمل یہ آیا کہ گرفتار شدگان جانتے ہیں کہ اگر ہم نے مجاہدین کے کارندے ہونے کا اقرار کرلیا تو اس صورت میں ہماری سزا کیا ہوسکتی ہے۔ لامحالہ اگر ان کی مت نہیں ماری گئی تو وہ ہرگز یہ تسلیم نہ کریں گے کہ ہم مجاہدین کیونکہ اگر کوئی ایسا کرتا تو یہ ہو نہیں ہوسکتا تھا کہ حکومت فوراً انہیں سزا دے دے بلکہ ایک لامتناہی سلسلہ پوچھ گچھ کا اور اس کے نتیجے میں بے حساب گرفتاریاں اور مقدمات کا دور چل جائے گا بہر حال ان کے لیے صرف یہی راستہ ہے کہ وہ مجاہد ہونے سے انکار کریں۔ ایسی صورت میں جب یہ محضر پہنچ جائے گا تو ان کے انکار کا پول کھل جائے گا۔ چنانچہ میں نے حضرت امیر صاحب کی خدمت میں اپنا خیال ظاہر کردیا اور وہ محضر ضائع کردیا گیا۔

دوسرا شکار:۔

حافظ اسحق اب اپنے دوسرے شکار کیلئے جال تیار کررہا تھا۔ اس نے حضرت امیر کو مشورہ دیا کہ اب آپ میرے ساتھ بھائی ذوالقرنین صاحب کو تیار کریں تاکہ ہم جلدی روپیہ یہاں لے آئیں اور ہندوستان جاکر انصار کو ترغیب دیں کہ لوگ مزید سرمایہ فراہم کریں تاکہ اس نقصان کی تلافی ہوسکے۔ انہی ایام میں عبدالغنی صاحب مرحوم اور مجھے اور

حاجی عبدالحلیم صاحب کو کہیں جانا پڑا اور ہمارے میں رخصت ہو جانے کے بعد امیر صاحب نے اسحٰق سے مشورہ لیا کہ ذوی القرنین چونکہ پشتو جانتا ہے اور اس کی علاقہ میں بہت واقفیت اور رسوخ ہے اسے یہاں کے کام کے لیے رہنے دیا جائے اور بلال بھائی جو نہایت معتبر شخصیت رکھتا ہے بہتر رہے گا۔ حافظ تو بہر حال کار آمد بھائیوں کو لشکر سے نکال کر مرکز کی قوت توڑنا چاہتا تھا، راضی ہو گیا اور بلال بھائی کو ساتھ لے کر چلتا بنا۔ یہ اس کا آخری شکار تھا۔ اس کے بعد وہ لشکر میں آ ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ میرے نفاق کا پول کھل جائے گا۔ بلال بھائی کی گرفتاری اور سزایابی کا حال لشکر میں جو موصول ہوا اس کی روداد کچھ اس طرح ہمیں ملی۔ بلال بھائی کو جب ہندوستان جانے کا حکم ہوا تو اس کی طبیعت قدرے ناساز تھی مگر وہ مجاہد تھے جو حکم سنے اور بیماری یا کسی اور عذر کو خاطر میں لائے اسی حال میں روانہ ہو گیا۔ اس دفعہ حافظ نے غالباً اپنے پروگرام کے مطابق جو وہ اپنے نئے شکار کے سلسلے میں پہلے خفیہ پولیس والوں سے طے کر چکا ہوگا، باجوڑ، سیلں کلی اور جلال بخاری اور چکدرہ کا راستہ اختیار کیا اور تخت بائی ریلوے سٹیشن جو مردان اور چکدرہ کے درمیان ایک ریلوے سٹیشن ہے اس سٹیشن پر پولیس کے حوالہ کیا۔ بلال بھائی کی زبانی جو دوران مقدمہ کسی عدالت کی پیشی کے موقعہ پر بہر حال کسی طرح ایک ہمدرد کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوا۔ اس کا بیان ہے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پولیس والے کئی دنوں سے ہمارے منتظر تھے

---

۵۱ یوں تو ہر مجاہد معتبر تھا مگر بعض بھائی اپنی کارکردگی کے باعث شہرت پا چکے تھے۔ چنانچہ بلال بھائی روپیہ کے متعلق اکثر کاروبار کرنے کی واقفیت اور تجربہ رکھتا۔ ہندوستان سے جو روپیہ لشکر میں آتا تھا وہ عموماً سو یا ہزار کے نوٹوں کی صورت میں ہوتا تھا۔ بلال بھائی جلال آباد جا کر ان نوٹوں کو کابلی روپے میں بدلوا لایا کرتا تھا۔ کیونکہ اس علاقہ میں روپیہ کابلی چلتا تھا۔

۵۲ ریاست دیر کی حدود میں ایک متبرک مقام جہاں جلال بخاری ایک بزرگ مدفون ہیں اور جو سڑک ریاست دیر سے ہوتی چترال کو گئی بر لب سڑک واقع ہے۔

انہوں نے حافظ کو اٹھا لیا۔ جیسا کہ کشتی کے اکھاڑے میں سے کشتی جیتنے والے کو لوگ اٹھا لیتے ہیں۔ اور بخار کی حالت میں ہی جو متواتر سفر کی وجہ سے شدت اختیار کر چکا تھا۔ مجھے مار پیٹ شروع کر دی۔

عدالت میں پیشی :۔

بلال بھائی کو جب مقدمہ تیار کر کے عدالت میں پیش کیا گیا تو اس پر چمر کنڈ سے بم اور بندوق وغیرہ آتشیں اسلحہ ہندوستان پہنچائے جانے کا الزام عائد کیا گیا تھا اور اس کے لیے ایک مقامی پٹھان کو وعدہ معاف گواہ کی حیثیت سے پیش کیا جس نے بیان کیا کہ میں اور بلال چمر کنڈ سے اسلحہ لے کر ہندوستان میں پہنچایا کرتے تھے اور اس سلسلے میں کئی اور بے گناہ بھی پولیس نے پھانس لیے جو پولیس کی نظر میں مجاہدین کے ہمدرد تھے جن میں سے کچھ تو پشاور سے متعلق تھے اور مولانا محمد حسین ہزاروی مدرس مدرسہ سلفیہ امرتسر بھی پھانسے گئے تھے۔ اتفاق سے اسی دن بھائی عبدالرحمن اور سراج دین بھی پیش کیے گئے تھے۔ جج ایک انگریز تھا۔ مگر تھا کوئی شریف النسان۔ جب وعدہ معاف اپنا بیان دے چکا۔ ابھی جج نے بلال بھائی اور اسحٰق کے بیانات سننا تھے کہ سراج دین نے جج اور تمام حاضرین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ بول اٹھا جناب یہ شخص بالکل جھوٹا ہے۔ جج صاحب نے سوال کیا کہ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے اس نے عرض کیا کہ حافظ اسحٰق کو باہر بھیج دیا جائے۔ جج صاحب نے حافظ مذکورہ کو باہر جانے کا حکم دے دیا۔ حافظ کے باہر جانے کے بعد سراج دین بھائی نے کہا۔ حضور اس سے چمر کنڈ کا نقشہ پوچھا جائے۔ جج نے سلطانی گواہ کو چمر کنڈ کا نقشہ بیان کرنے کو کہا۔ اس نے اوٹ پٹانگ جو منہ آیا لکھ دیا۔ جب وہ نقشہ بیان کر چکا تو سراج بھائی نے درخواست کی کہ حضور اب حافظ اسحٰق کو طلب کیا جائے حافظ طلب کر لیا گیا۔ اب سراج دین صاحب بولے۔ جناب حافظ صاحب کو چمر کنڈ کا نقشہ بیان کرنے کو کہا جائے۔ اب حسب الحکم جج صاحب حافظ موصوف نے چمر کنڈ کا نقشہ بیان کیا۔ جج صاحب نے جب اتنا تضاد بیان میں پایا۔ کیونکہ گواہ مذکور

نے جمر کنڈ دیکھا تک نہیں تھا اور اس یقین کی بنا پر سراج الدین کو جرح کی سوجھی تھی۔ وہ پولیس پر برس پڑے کہ ایسے بے بنیاد فراڈ عدالت میں لا کر عدالت کا وقت خراب کیا جاتا ہے اور عدالت کو دھوکا دیا جاتا ہے۔ جج صاحب غصے میں عدالت سے اٹھ کر چلے گئے رات میں پتہ نہیں پولیس نے کس طرح جج صاحب کو اپنی مجبوری کا بیان کیا کہ اگلے دن جج صاحب نے بلال کو مخاطب کر کے کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہیں دو سال کی سزا دیتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ عبدالرحمن بھائی اور سراج الدین بھائی کو بھی دو دو سال سزا ہو گئی اور اسی وجہ سے صالح بھائی بھی لمبی سزا سے بچ گئے۔ مگر اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ سراج الدین بھائی اور صالح بھائی اور بلال بھائی تینوں صاحب اپنی سزا پوری ہونے سے پہلے جیل میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنو ربنا انک رؤف رحیم۔

غلامی کا دور:۔

آگے بڑھنے سے پہلے اس مقام پر میں اپنے عجز کا اظہار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں واقعات کو تسلسل سے بیان کرنے سے میں اپنے کو مجبور پاتا ہوں۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ میں ان نگارت کو حوالہ قلم کرنے کے لیے زندہ بچوں گا تو میں اس کیلئے تیاری کرتا رہتا۔ حالت یہ ہے کہ اس وقت جب کہ رات کے ڈھائی بجے ہیں میں ایک بجے سے قلم ہاتھ میں لیے واقعات کے تسلسل کی یاد میں محو ہوں۔ کبھی میں اس عہد کے ہندوستان پر نظر ڈالتا ہوں کہ اس تحریک کا مقصد اول ہندوستان کو آزاد کرا کے اس میں منہاج نبوت پر اسلامی حکومت کا قیام تھا۔ اس کے بعد اسی نہج پر عالم اسلام کو خلافت راشدہ کے نظام کی طرف لوٹانا تھا۔ اس مقصد عظیم کے لیے جو تحریک اٹھائی گئی تھی اور اس تحریک کے بانیوں نے جس طرح پروانہ وار قربان ہو کر قوم کے لیے ایک مشعل روشن کی تھی۔ بدقسمتی سے قوم کی اکثریت نے قربانی کو ناکامی کا نام دے کر اس سے کنارہ کشی اور بے تعلقی کا اظہار

کیا تھا اس کے نتیجے میں قوم پر غلامی جیسی لعنت مسلط ہو گئی تھی۔ پھر قوم کے ایک قلیل مگر صالح عنصر نے اسی قندیل کو پھر روشن کیے رکھا تھا۔ مگر اکثریت اس سے نہ صرف غافل ہو گئی۔ بلکہ غلامی کو ترجیح دیتے ہوئے اسی پر مطمئن ہو کر تباہی کی طرف راغب رہی۔ اگر کبھی اس قندیل کی روشنی سے متاثر ہو کر غلامی کا جوا اتارنے کا جذبہ ابھرا بھی تو احساس کمتری کے باعث اغیار کے سہاروں پر انحصار کیے رکھا اور مرحوم میر کے قول کے مطابق ۔ ؎

میر کیا سادہ ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

جس قوم کی غداریوں اور بے وفائیوں سے وہ اس نوبت کو پہنچی تھی اسی کا سہارا ڈھونڈنے لگی اور اس کے نتیجے میں آج قوم کا کچھ حصہ ابھی تک ان اغیار کے جوئے تلے پس رہا ہے اور کچھ حصہ لولے اور لنگڑے پاکستان کے حصول پر فخر اور اترا بھی رہا ہے۔ اغیار کے چرکوں سے کراہ بھی رہا ہے فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اقتدار کی حرص :۔

اس قوم کی سادگی یا نصب العین اور مقصد اصلی سے دوری آج سے نہیں۔ جب سے اقتدار کی اندھی بھوک نے اس قوم کے اکابرین کو متاثر کیا ہے۔ یہ فرقوں اور ٹکڑوں میں بٹ کر تباہی کے غار میں گر رہی ہے۔ اس قوم کے اکابر کو اسلام سے غداری اور عوام کی سادگی نے ایسے ایسے گل کھلائے ہیں اور ایسے ایسے فتنے کھڑے کیے ہیں۔ جنہوں نے قوم کے اکثر حصے کو تباہی کے غار کے اس کنارے پر لا کھڑا کیا ہے۔ جس سے بچانے کے لیے اسلام آیا تھا۔ کیا یہ افسوس کا مقام نہیں کہ ایک خدا کا بندہ قرآن اور سنت کی مشعل روشن کرتا ہے اور یورپ کی دوربین آنکھ جب اس روشنی کو دیکھ کر بھنا جاتی ہے۔

وہ اس روشنی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقت کا نقشہ دیکھ کر اس کی چکا چوند سے آنکھیں مندھ لینا چاہتی ہے۔ معاوہ اس خوف سے کہ اگر یہ شخص اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو کفر کا مستقبل تاریک تر ہو جائے گا۔ وہ اس قوم کی سادگی، رجائیت اور امراء کی حرص کے مرض سے بھی باخبر ہے اور اس قوم کے معمولی فیقی اختلاف کے رکھنے کا بھی اسے علم ہے۔ چنانچہ یورپ خیر خواہ اور عالم کے بھیس میں اس وقت کے حکمرانوں کو ان کے زوال کے خدشہ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور خود غرض اور غدار اسلام حکمران اغیار کی عیاری نہ جان کر اپنے ہاتھوں نہ صرف اس قندیل کو محو کر دیتے ہیں بلکہ قوم کو حنفی دھابی کے فتنے کی بھینٹ چڑھا کر داد عیش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جس سے قوم آج تک نجات نہیں پا سکی۔ بلکہ اب تو بہت سے لوگوں کا روزگار اسی فتنہ سے وابستہ ہو چکا ہے۔ اس سے نجات کی کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی بلکہ میں تو محسوس کرتا ہوں کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ قوم کو اس سازش سے نکالنے کی کوشش کرے تو جن لوگوں کی روزی اس فتنہ سے وابستہ ہے وہ اسے ہی اس اتہام سے نوازنہ کر قوم کو اس عذاب سے نجات نہیں پانے دیں گے۔ بلکہ ایسا عملاً ہو رہا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی اللہ کا بندہ اس فتنہ میں ثالث بالخیر بن کر سامنے آنے کی کوشش کرتا ہے تو اکثریت اس کے ساتھ یہی سلوک کرتی ہے اور اسے پہلا انعام یہی ملتا ہے کہ یہ گستاخ اور بیدین دھابی ہو گیا ہے۔ مگر اس دین کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالےٰ نے لے رکھا ہے اس لیے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے۔ اس فتنہ کے مقابلے میں بخشش دیتا ہے۔ خدا کا فرمان ہے۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون

باب پنجم
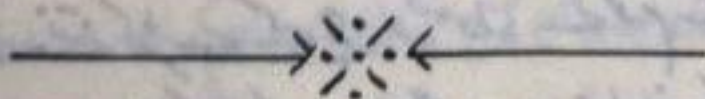
غازی عبدالرشیدؒ

اخبار المجاہد کے سلسلہ میں غازی عبدالرشید کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔
غازی عبدالرشیدؒ غالباً ضلع مظفرنگر یوپی کے علاقہ سے ہجرت کر کے کابل آ گئے تھے موصوف سے میرا تعارف اخبار اتحاد مشرقی جلال آباد افغانستان کے دفتر میں ہوا۔ جہاں وہ کاتب کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے تھے۔ میں وہاں المجاہد کے انتظامات کے سلسلہ میں گیا تھا۔ اس سے قبل صورت آشنائی صوبے دار یوسف خان کا ہمسایہ ہونے کی وجہ سے تھی۔ برہان الدین کشکی اخبار مذکور کے مدیر اعلیٰ تھے۔ دونوں اصحاب نے میری امداد بیرونی اخبار مہیا کرنے کے سلسلہ میں کی تھی مگر جب اخبار جاری ہو گیا اور اس سلسلہ میں مجھے متواتر دفتر اتحاد مشرقی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ غازی موصوف سے میرے تعلقات بڑھتے گئے۔ انہیں کی وساطت سے میں نے پریس مین فضل الرحمٰن بھائی کو چھپائی کا کام سکھایا اور پھر ایک مجاہد عبدالقدیر کو کتابت سیکھنے کی خاطر ان کے پاس چھوڑا۔ اور انہوں نے نہایت جانفشانی سے عبدالقدیر کو ماہر کتابت کر دیا۔ جلال آباد میں اکثر انہی کے پاس میرا قیام ہوتا۔ اسی دوران انہوں نے مجھ سے نشانہ بازی کی مشق کی۔ حالانکہ صوبیدار یوسف خان صاحب اپنے ہمسائے تھے۔

غازی صاحب کا پلان :۔

ایک دفعہ میرا قیام جب ان کے ہاں تھا۔ رات کو انہوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ میں عنقریب یہاں سے چلا جانے والا ہوں۔ میرے اصرار پر انہوں نے کہا کہ ہندوستان کے ارادے ہیں میں نے کہا کہ میں تو سمجھے ہوئے ہوں کہ آپ یہاں پر مجاہدین کے نمائندہ

کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ ہندوستان جہاد ہی کی غرض سے جاؤں گا خیر باشد میں نے کہا۔ کہنے لگے تین ناپاک ہستیوں سے ہندوستان کو پاک کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے شردھانند۔ کالی چرن اور راجپال تین نام گنے میں نے کہا کہ انگریزوں کے وجود کی برکت سے ہندوستان ایسے ناپاک لوگوں سے بھرا پڑا ہے اور خود ہندو قوم اپنے خبیث باطن کی وجہ سے گستاخ ہے ورنہ کیا وجہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کے اس دور میں کوئی ہندو لیڈر ان کے روکنے کی کوشش نہیں کرتا اس پر انہوں نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ ان تینوں کے ٹھکانے لگانے کے بعد ہندو لیڈروں اور ہندو عوام کے کان کھل جائیں۔ میں نے مزید اصرار کیا کہ ایسا ارادہ بدل ڈالیں۔ کیونکہ ہندو قوم مسلمانوں پر ہر طرح فوقیت لے جا چکی ہے۔ اول تو آپ تینوں کو ٹھکانے لگا کر اپنی قیمتی جان بچا نہیں سکیں گے۔ دوسرے ہندوؤں میں ایسے افراد کی کمی نہیں۔ ممکن ہے وہ مشتعل ہو کر مسلمان لیڈروں کے درپے ہو جائیں۔ آپ جانیں ہماری قوم میں قحط الرجال ہے۔ بہر حال اس وقت خاموش ہو گئے وہ میرا کہا اکثر مانتے تھے۔

غازی صاحب کا خط:۔

کچھ دنوں بعد افغانستان کے راستے آنے والی ڈاک میں ایک لفافہ[1] میرے نام ملا جو غازی صاحب نے دہلی سے لکھا تھا اس میں انہوں نے جلال آباد سے چل کر دہلی پہنچنے کی کیفیت صاف صاف یوں لکھی تھی۔ میں افغانستان کے پاسپورٹ پر افغانی شہری کی حیثیت سے جلال آباد سے رخصت ہوا۔ پشاور پہنچنے پر مجھے روک لیا گیا۔ اور انگریز کمشنر پولیس (اجو پولیٹیکل پولیس سے متعلق ہے) کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ کیوں جی آپ اتحاد مشرقی میں برطانیہ کے خلاف المجاہد کے مضامین

---

[1] ایسے خطوط اکثر اشاروں کنائیوں میں لکھے جاتے تھے جب کہ راستے میں دوسرے ملک سے آنے والی ڈاک سنسر ہوتی تھی۔

درج کیا کرتے تھے اور عبدالکریم سے آپ کی بڑی گہری چھنتی تھی۔ چلیے ذرا میں آپ کو وہ مقامات دکھاؤں جہاں قبائلی ڈاکو برطانوی رعایا کو لوٹ مار اور اغوا کی وارداتوں سے پریشان کرتے تھے میں نے کہا چلیے ذرا وہ جگہ بھی ایک نظر دیکھ لیں جہاں آپ کی بہادر فوجوں نے قبائلی بستیوں پر حملہ کیا اور اپنی بے شمار نعشیں چھوڑ کر جب فرار ہوئے تو انتقاماً بستی کو آگ لگا دی اور مسجد تک کو نہ چھوڑا۔ اور مسجد کو آگ لگاتے ہی جب وہاں کا ضعیف نابینا پیش امام جان بچانے کے لیے نکلا تو اس کو پکڑ کر آگ میں جھونک دیا وہ بے چارہ مسجد میں اس لیے رک گیا تھا کہ مجھے کون سنگدل ستائے گا اس غریب کو کیا پتہ تھا کہ برطانیہ کی بہادر فوجیں جب مار کھا کر بھاگیں گی تو آتش انتقام سے مجھے یوں بھون ڈالیں گے۔ الغرض مجھے تین دن تک روکے رکھا۔ اسی طرح مجھے جلی کٹی سنایا کیے اور مجھ سے بھی ویسی ہی سنا کیے میں حیران ہوں کہ انگریز پولیس کمشنر کو المجاہد اور میرے تعلقات اور عبدالکریم اور میری محبت کا اس طرح مفصل حال معلوم ہوتا رہا اور مجھے دیکھتے ہی کیسے پہچان گیا۔ گویا کہ وہ میرا منتظر بیٹھا تھا۔ آخر میں لکھا تھا کہ مجھے قلم تراش کی ضرورت ہے۔ اس لیے وہ ضرور بھیج دو۔

خطوط کا انتظام :۔

اس نحیف الجثہ[1] گرد شمن کے لیے عظیم الغضبہ ننگی تلوار کی ایمانی قوت حیرت انگیز تھی۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان کی ڈاک بغیر سنسر کے نہیں رہے گی۔ میری ڈاک چونکہ سرحد کے اندر روان لیٹر بکس میں ڈالی جاتی تھی اس لیے سرحد پر تو سنسر کا خطرہ نہیں تھا۔ دہلی میں ان کا انتظام ایسا تھا کہ چٹھی ان کو بغیر سنسر ہوئے مل سکتی تھی۔ میں نے اس کا جواب دیا۔ اس کے جواب میں اس بندہ خدا نے صاف لکھ دیا کہ میں نے قلم تراش پولیس سے حاصل کر لیا ہے اس لیے اب آپ نہ بھیجیں۔ اس جواب پر سوائے حیرت کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد ان کا خط تین سال تک نہ ملا۔

---

[1] غازی عبدالرشید نہایت لاغر جسم اور نحیف شکل و شباہت رکھتے تھے۔ بالوں میں کچھ سفیدی نمودار ہو چکی تھی

مولانا محمد علی جوہرؒ سے ملاقات:۔

۱۹۲۵ء کے اگست میں مجھے حضرت مولانا محمد علی جوہرؒ سے جماعت مجاہدین کے نمائندے کی حیثیت سے حاضری کا موقعہ ملا۔ میں پہلے غازی صاحب سے مل کر مولانا صاحب کی خدمت میں حاضری کے لیے جانے لگا تو غازی صاحب نے کہا میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ وہاں آپ کو میری ضرورت پیش آئے گی۔ میں شام کی نماز کے بعد حضرت مولانا کے مکان پہ پہنچا۔ غازی صاحب موصوف کا خیال درست تھا۔ غازی صاحب موصوف نے ہی میری آمد کی اطلاع پہنچائی۔ اور ان کے ذریعے مجھے اندر بلایا گیا۔ مولانا موصوف سے مختصر تعارف امرتسر مولانا داؤد غزنوی مرحوم کے ذریعہ ہو چکا تھا۔ میں تقریباً دو گھنٹے مولانا سے مصروف گفتگو رہا۔ غازی صاحب دوسرے کمرے میں منتظر رہے۔ فارغ ہو کر میں غازی صاحب کے ہمراہ ان کے مکان پر آ گیا۔ ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس وقت موصوف نے بتایا کہ میں فی الحال اپنے پروگرام کو ملتوی رکھے ہوئے ہوں۔ مگر ایک سوا سال کے بعد ہی حالات نے پلٹا کھایا شردھانند نے ایک مسلمان شادی شدہ لڑکی کو اپنے چیلوں کے ذریعہ سکھر سے اغوا کرا لیا۔ اور اس کی طرف سے اسلام اور بانی اسلام کی شان میں گستاخیاں شروع ہو گئیں اور پھر ہندو جج نے لڑکی کے خاوند کو یہ کہہ کر مایوس کر دیا کہ مست مذہب تبدیل کر کے تمہاری قید نکاح سے آزاد ہے اور اسے آریوں کے حوالے کر دیا۔ مستغیث نمائندے بچوں کے لیے سوال کیا۔ جج بولا اس کے لیے دیوانی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ لڑکی کے خاوند نے شردھانند کو مخاطب کر کے مختصراً کہا کہ تم نے زبردستی میری بیوی اور بچے چھین لیے ہیں۔ مگر اوپر کوئی ہستی ہے جو ضرور تم سے مجھ غریب کا انتقام لے سکتا ہے۔

شردھانند کا قتل:۔

اس فیصلہ کے بعد غازی صاحب مشتعل ہو گئے۔ نتیجے میں شردھانند قتل کر دیا گیا۔ مجھے یہ خبر مولوی سلیمان صاحب نے بتائی۔ وہ میرے ہمسائے میں رہائش پذیر تھے۔

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا کہ غازی صاحب رہ نہ سکے۔ نتیجتہً کئی راتوں تک پولیس رات کو بھی میری نگرانی کرتی رہی۔

بظاہر غازی صاحب کے ذکر کو جمعیت مجاہدین سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر غازی صاحب کی اس قربانی کو مجاہدین کے ساتھ میل جول اور ان کی صحبت کے اثر سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ بے شک غازی صاحب موصوف مجاہدین کی زندگی کو آنکھوں سے دیکھ کر متاثر ہوئے اور نیک نیتی اور خلوص سے انھوں نے ایک دشمنِ دین کو اس کے انجام تک پہنچایا۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ وراحمہ۔ وادخلہ فی الجنۃ الفردوس۔ (آمین)

باب ششم

مولانا بشیرؒ افغانستان میں

یہ مضمون بہت طویل ہے اور اس کو پورے طور پر جاننے کے لیے افغانستان کے پس منظر کو ایک نظر دیکھنا چاہیے۔ کیونکہ مولانا بشیر کے افغانستان آنے سے افغانستان نے جو ترقی یا آزادی حاصل کی وہ بشیر کی کوششوں ہی کے نتیجے میں ملی تھی۔ اس لیے یہ کارنامہ بشیر کی وساطت سے جمعیت مجاہدین ہی کا سمجھا جانا چاہیے۔ واقعات خود اس کی عکاسی کرتے ہیں۔

افغانستان کی سیاسی حیثیت:-

افغانستان زیادہ سے زیادہ برطانیہ کا حاشیہ بردار تھا اس کی خارجہ پالیسی وائسرے ہند کے ماتحت تھی۔ والئی افغانستان امیر حبیب اللہ خان کو ہندوستان کے دورے کے دوران اتنا دہشت زدہ اور مرعوب کر لیا گیا تھا کہ پہلی جنگ عظیم میں جبکہ ہندوستان میں نہایت قلیل فوج رہ گئی تھی، امیر حبیب اللہ جرمن اور ترک وفد کو راستہ تک دینے کی بھی جرأت نہ کر سکا۔ خارجہ پالیسی یہ تھی کہ برطانیہ کا کوئی دشمن پناہ لینے کے لیے اگر افغانستان میں داخل ہوتا تو افغانوں کا پناہ دینے والا قومی جذبہ بھی اس کی حفاظت نہ کر سکتا۔ اور وہ فرنگی کے اشارے پر جیل میں بند کر دیا جاتا۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے چند انگریز دشمن جیل میں بند تھے۔ جن میں مولانا عبید اللہ سندھی اور اُن کے ساتھی بندہ مفرور کا لجیٹ قابل ذکر ہیں۔ یہ حالات تھے جب حضرت مولانا بشیر صاحب بحیثیت نمائندہ جمعیت افغانستان میں وارد ہوئے۔ مولانا موصوف نے حالات کا جائزہ لیا اور افغان حکمرانوں سے سلسلہ

جنبانی شروع کی۔ امیر حبیب اللہ کا مقام ادب یہ لیسی پہلی ملاقات ہی میں آشکارا ہوگئی اور جب مولانا نے نائب السلطنت نصر اللہ خان برادر امیر موصوف سے ملاقات کی تو ان کو ایک جوہر قابل پایا۔ مولانا نے نائب السلطنت کو اس کی طاقت اور پوزیشن سے باخبر کیا اور ان کو اپنے اختیارات کے استعمال کی دعوت دی۔ چنانچہ نائب السلطنت نے اپنے اختیارات کا مظاہرہ کرتے ہوئے مندرجہ بالا اصحاب محبوسین کو رہا کر دیا۔ مولانا کا کہنا درست تھا۔ امیر حبیب اللہ دانت پیس کر رہ گیا اور سابقہ محبوسین شاہی مہمان کی حیثیت سے دندنانے لگے۔ امیر موصوف اپنے بھائی سے تو کچھ نہ کہہ سکا۔ مگر بشیر صاحب کا جانی دشمن بن گیا اور ساعلان کر دیا۔ کہ بشیر کو زندہ یا مردہ پکڑ کر لانے والے کو انعام دیا جائے گا۔ اور اس اعلان کے باوجود مولانا بشیر کابل میں اپنے اہم مقصد بڑھا رہے تھے۔

تیراہ میں ترک وفد:۔

جب امیر حبیب اللہ نے جرمن وفد کو ناکام کر دیا تو دو ترک ناظم بے اور خیری بے تیراہ میں پہنچا دیے گئے۔ جن کے ساتھ چند مجاہدین بھی کر دیے گئے اور ہندوستان میں مشہور ہو گیا کہ تیراہ میں ترک آ گئے ہیں۔ اگر تیراہ کے غدار خوانین فرنگی کی طرفداری نہ کرتے تو سرحد تیراہ سے وہ طوفان اٹھتا جو فرنگیوں کے قدم ہندوستان سے اکھیڑ دینے کے لیے کافی تھا مگر خوانین کی غداری نے فرنگی کا ساتھ دیا اور وہ کمزور ملک جو انگریزی دشمن کی وجہ سے عزت و احترام کا مستحق تھا مع چند مجاہدین و ترکوں کے محصور ہو کر رہ گیا میں نے اس حالت کے متعلق خیری بے ترک کی چٹھی خود دیکھی ہے۔ جس میں اس نے اپنا حال لکھ کر امیر چمرکنڈ سے استمداد چاہی تھی اور آخر میں لکھا تھا جس طرح ہو سکے بشیر کو ہماری امداد کے لیے بھیجیں۔ وہ چٹھی لیکر سعد بھائی ایک مجاہد ساٹھ میل روزانہ پیدل طے کر کے تین دن میں چمرکنڈ پہنچا اور پھر بغیر کسی تعطل کے کابل پہنچا۔ مولانا بشیر بھاگ دوڑ کر کے جب تیراہ میں وارد ہوئے محصورین نہایت تنگ ہو چکے تھے ان کے گرد کا حصار سخت تنگ ہو رہا تھا۔

یہ ایک نہایت عجیب صورت حال تھی انگریزوں نے والی افغانستان کو کامل طور پر

پھانسی پانے کے بعد خوش فہم مسلمان قوم کے لیے شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشگوئی کے نام پر یہ تاثر دے رہے تھے کہ یہ حبیب اللہ وہی ہے۔ آخر حبیب اللہ آمد بنصر اللہ اور خوش فہم قوم اس پر ایمان لاکر ایک ایسے شخص پر نصرت کی امید کر رہے تھے جو انگریز کی غلامی میں ان خوش فہموں سے بھی زیادہ بے بس تھا۔

حال یہ تھا کہ ملائی طاقت کو فرنگی کے بھیجے ہوئے مولویوں نے ایک دوسرے کے خلاف فتوی بازی کے ذریعہ منتشر کر رکھا تھا۔ قابل ذکر دو طاقتیں ملا اکاخیل اور محمود اخوند زادہ میں یہاں تک اختلاف رونما ہو چکا تھا کہ انہوں نے اپنے مقتدین کو یہاں تک کہہ رکھا تھا کہ میں فلاں صاحب سے بعد میں مروں اور وہ زمین کے اندر مدفون ہوں تو مجھے زمین کے اوپر ٹیلا بنا کر دفن کریں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ اس زمین میں دفن کیا جاؤں جس میں فلاں مردود دفن ہو اور اس قضیہ کو پیدا کرنے میں صاحبزادہ عبدالقیوم نے بحیثیت پولیٹیکل ایجنٹ بے حساب روپیہ خرچ کر ڈالا تھا۔ مولانا موصوف کو نے اس جال کو توڑنے کیلئے ملائی طاقت استعمال کرنے کا ارادہ کیا اور ایک رات ملاں اکاخیل کو صرف پندرہ پونڈ ہدیہ دے کر بیدار کرلیا۔ اور دوسری رات محمود اخوند زادہ کو اسی قدر ہدیہ سے اسلام کی امداد کے نام پر اٹھا لیا۔ اور اگلے دن دونوں ملائی کے متفقہ لشکر نے غدار خوانین کے قلعوں کو آگ لگادی۔ جو پشتو کے رواج کے مطابق انتہائی ذلت آمیز سزا تصور کی جاتی ہے اور جب غداروں کا سردار ملک شیر زمان فرار ہو کر صاحبزادہ عبدالقیوم کے پاس پہنچا تو اس نے ملک مذکور کو نہایت ذلت سے نکال دیا۔ اور ملک موصوف کے کو کہنا پڑا کہ ہمارا جال نہایت مضبوط تھا مگر بشیر خدا جانے کس قوت کا مالک ہے جس نے ہمیں پتہ بھی نہ ہوتے دیا اور ہمارا جال الٹا ہم پر وبال جان بن گیا۔

صاحبزادہ صاحب نے مولانا صاحب کو پیغام بھیجا کہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کے بیوی، بچے ہمارے قبضے میں ہیں اور ہمارا انتقام کتنا سخت ہوتا ہے۔ مولانا نے کہلا بھیجا کہ میں آپ کا بہت مشکور ہوں گا۔ اگر میرے بیوی بچے کا حشر مجھے دکھا کر کیا جائے تا کہ آپ کو انتقام لینے میں زیادہ لذت ملے اور میں اپنی آنکھوں سے ان کا انجام دیکھ کر آئندہ بے فکر ہو سکوں۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔

مولانا بشیر کا اثر و رسوخ :-

کابل میں مولانا بشیر کے ہم خیالوں میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ حتیٰ کہ شاہی خاندان کے نوجوان شہزادہ امان اللہ خان اُن کی والدہ علیہ حضرت۔ نادر خان صاحب جو بعد میں نادر شاہ کے خطاب سے تخت افغانستان پر متمکن ہوئے اور ان کا سارا خاندان شاہ ولی خان، شاہ محمود خان جو نادر خان صاحب کے چھوٹے بھائی اور امان اللہ خان کے بہنوئی تھے۔ مولانا کا مقصد تھا مقصد افغانستان کی مکمل آزادی تھا اور باغستان میں فرنگی رسوخ کا خاتمہ اور اس میں سب سے بڑا سنگ گران امیر حبیب اللہ خان تھے اور اس مقصد عظیم کے حصول کے لیے ایک پتھر کی پوجا کب تک روا رکھی جا سکتی تھی۔ بشیر رح کی جان کی قیمت ڈالنے والا اپنی جان سے ہاتھ دھونے والا تھا۔ آخر تین سال کی کشمکش کے بعد اس سنگ گران کو راستے سے ہٹا دیا گیا اور لغمان کے سرمائی مقام میں ۱۹۱۹ء کے آخر میں موصوف اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

امان اللہ خان کی تخت نشینی :-

فیصلہ یہ ہوا تھا کہ نصر اللہ خان نائب السلطنت تخت نشین ہوں گے اور نائب السلطنت امان اللہ خان ہوں گے۔ جنہوں نے اس کشمکش کے دوران بہت محنت سے مولانا کا ہاتھ بٹایا تھا اور مولانا نے خاص طور پر اُن کی تربیت کی تھی۔ مگر علیہ حضرت نے مصلحتاً امان اللہ خان کو کابل روک لیا اور نصر اللہ خان نے اپنی تخت نشینی کے اعلان کے ساتھ شہزادہ عنایت اللہ خان کو نائب السلطنت کے طور پر نامزد کر دیا۔ امیر امان اللہ خان نے کابل میں اپنی شاہی کا اعلان کر دیا۔ اور نصر اللہ خان کو کابل طلب کر لیا۔ اس طرح افغانستان کی باگ ڈور امان اللہ خان کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے باگ ڈور سنبھالتے ہی افغانستان کی مکمل آزادی کا اعلان کر دیا۔ انگریز کب چوکنے والے تھے۔ پہلی جنگ عظیم ختم ہو کر ہندوستان فوجوں سے بھرپور تھا۔ حملہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ادھر نادر خان صاحب کو فوج کا سپہ سالار بنا دیا گیا تھا۔ صالح محمد خان ایک سول افسر جنہوں نے اعلان شاہی کے وقت امان اللہ خان

کی حمایت کی تھی۔ سمت مشرقی جلال آباد کے گورنر مقرر کر دیے گئے تھے۔ اس موقعہ پر سپہ سالار نادر خان کی مشہور تقریر جس کا ہندوستان کے لیڈروں نے بہت خیر مقدم اور چرچا کیا تھا مولانا البشیر کی لکھی ہوئی تھی۔

افغانستان کی جنگ آزادی

اس جنگ کا نقشہ کچھ اس طرح تھا۔ قندھار کے محاذ پر اس وقت کے وزیر اعظم عبد القدوس خان اور کوہاٹ ٹل اور بنوں کی چھاؤنیاں کے مقابل۔ تیراہ۔ آفریدی۔ شینواری۔ منگلی اور حاجی حیدران قبائل پڑتے تھے۔ اس محاذ پر جنرل نادر خان سپہ سالار مامور تھے اور رزمک جنڈولہ اور وانہ کی چھاؤنیوں کے مقابل محمود اور وزیر قبائل تھے حاجی عبد الرزاق صاحب جو دیوبند کے فاضل تھے۔ اس محاذ کے قائد تھے۔ ڈکے کا محاذ نہایت مخدوش ہو گیا تھا جس کا ذکر آگے آئے گا۔

نوشہرہ، چکدرہ اور ہزارہ کے محاذ پر مجاہدین چمرکنڈ اور اس میں مہمند باجوڑی قبائل ملا پائڈہ۔ حاجی صاحب ترنگ زئی۔ اسلام پور باچا اور کچھ افغانی فوج متعین تھی۔ اور مولانا البشیر اس محاذ کے منتظم تھے۔ یہ نقشہ مولانا البشیر نے محاذ کا بنایا تھا اور گورنر جلال آباد کو بھی مولانا موصوف کی ہدایت پر عمل پیرا رہنے کا پابند کر دیا گیا تھا۔ اس نقشے کے مطابق ڈکہ کا محاذ سب سے اہم تھا۔ گورنر کو اسی اہمیت کی وجہ سے پابند کر دیا گیا تھا۔

ڈکہ کا محاذ

پروگرام کے مطابق طے یہ تھا کہ فرنگی ڈکہ پر بہت زور لگائے گا اس لیے ڈکہ کو بچانے کے لیے دوسرے لفظوں میں فرنگیوں کو درہ خیبر میں جمع ہونے کا موقعہ دیا جائے گا اور اس غرض کے لیے ڈکہ کے قریب تورخم چوٹی پر توپخانہ نصب کر دیا گیا یہ فرض کر لیا گیا کہ فرنگی درہ خیبر کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی طاقت کا زیادہ حصہ اس

کھپا ئے گا اس لیے ٹل اور کوہاٹ کی طرف سے نادر خان نوشہرہ اور پنڈی کی طرف بڑھیں گے اور شبقدر اور چکدرہ کی طرف قبائل اور مجاہدین اور کچھ افغانی فوج مردان اور نوشہرہ کی طرف بڑھیں گے۔ دونوں طرف سے بڑھ کر دونوں فوجیں مل جائیں گی اور فرنگی کا عقب کاٹ دیا جائے گا۔ اور درہ خیبر میں فرنگی کی زیادہ قوت کو محصور کر کے ختم کر دیا جائے گا۔ اور اگر گورنر جلال آباد مولانا لبشیر کی ہدایات کو نظر انداز کر کے محاذ پر اپنی بجائے برگیڈیر شمس الدین خان کو محاذ پر رہنے دیتے جو ایک کہنہ مشق قائد افواج تھے۔ جس کی مولانا نے سخت تاکید کر دی تھی کہ گورنر جلال آباد میں رہ کر رسد و کمک کی نگرانی کرے اور فوج کو اپنی قوت کو کام میں لانے کے لیے آزاد چھوڑ دے۔ مگر گورنر نے یہ فرض کر کے کہ کچھ بھی ہو ہماری فتح یقینی ہے۔ یہ خیال کیا کہ فتح میرے نام لگے۔ خود محاذ پر جا پہنچا اور بریگیڈیر شمس الدین خان کو رسد و کمک کے لیے جلال آباد مامور کر دیا۔ اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی سول ڈیوٹی پر اور سولین افسر جنگی محاذ پر ناکام رہے۔ اب عملاً یوں ہوا کہ قندہار کے محاذ پر عبد القدوس خان نے فرنگیوں کی قوت کا مقابلہ کیا اور ان کے لیے افغانی علاقے میں گھسنا ناممکن کر دیا وزیرستان میں جو چوکیاں یا قلعے فرنگی کے قبضے میں تھے وہ وزیریوں اور محود قبائل نے فرنگی سے خالی کرا لیے۔ مگر یہ لوگ آگے نہ بڑھ سکے اور اس محاذ کے قائد حاجی عبد الرزاق صاحب نے اتنی کامیابی کو کافی سمجھا اور جنرل نادر خان نے منگل قبائل کی معیت میں ٹل پر قبضہ کر لیا۔ یہاں پر منگل قبائلیوں نے فرنگیوں کی مشین گنوں کی گولیوں کی بارش کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مشین گنوں پر قبضہ کر لیا۔ دشمن کے مشین چلانے والوں کے حواس خطا ہو گئے اور انہوں نے اقرار کر لیا کہ قبائلی کوئی جن ہیں جو اس گولیوں کی بارش میں بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ مگر دوسرے محاذوں خصوصاً ڈکہ کی پریشان کن خبروں کی وجہ سے نادر خان آگے نہ بڑھ سکے۔ ڈکہ محاذ پر سخت ناکامی کا سامنا ہوا اور اس محاذ کی ناکامی نے سارے محاذوں پر نہایت سراسیمگی کا عالم پیدا کر دیا۔ ابتدا میں جزوی کامیابی ضرور ہوئی۔ جب فرنگیوں کے دو بریگیڈ توپ کی زد میں آ گئے تو تورخم سے افغان توپچی نے توپوں کا منہ کھول دیا۔ اور دشمن کو سخت جانی نقصان پہنچایا۔ اس کے بعد دشمن نے ہوائی جہاز سے

کام لیا اور ہوائی جہاز سے بم گرا کر توپخانے کو اڑا دیا۔ اور ایک دو بم ڈکہ کی میدانی فوج پر بھی گرائے۔ چونکہ گورنر کو جنگ کا تجربہ نہ تھا اور بم کا ایک ٹکڑا گورنر کے پاؤں کو زخمی کر گیا اور اس کے منہ سے نکلا ہائے ما شہید شدہ موٹر بیار بیدا اور یہ کہتا ہوا گورنر محاذ چھوڑ کابل بھاگ گیا اور افغانی فوج بے سردار ہو کر سراسیمگی کے باعث فرار ہو کر اکثریت کابل بھاگ گئی ہوائی جہاز کی وجہ سے دشمن کو کامیابی ہوئی اب پالنسہ پلٹ رہا تھا۔ ہوائی جہاز نے کابل تک پرواز کی اور چند گولے کابل پر بھی برسائے مگر میدانی فوج کو آگے بڑھنے کی جراءت نہ ہوئی۔ خدا جزائے خیر دے غازی مرد ملا چکنور کو انہوں نے بڑھ کر خالی میدان پر قبضہ کر لیا اور کچھ انسروں کو فرنگی کی فوج میں بھیج کر یہ پیغام دیا کہ یہاں بے شمار اسلحہ مفرور فوج کا موجود ہے اگر آپ ہمیں خچر وغیرہ (بار برداری کا سامان) بھیج دیں تو ہم تمام اسلحہ لاد کر آپ کو پہنچا دیں، یہ چکمہ دے کر کئی سو گاڑیاں مع خچر حاصل کر لیں۔ کیونکہ ان کے پاس بار برداری کے سامان کی کمی تھی اور اس کے بغیر وہ دشمن کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔

فوج میں سراسیمگی

اس بھاگڑ کے نتیجے میں سارے محاذوں پر خصوصاً شبقدر اور چکدرہ کے محاذوں پر بہت سراسیمگی اور ابتری پھیل گئی۔ جلال آباد والوں کو محاذ کی حالت کی تو خبر نہیں تھی البتہ ان کو انتظار تھا کہ فرنگی فوجیں ڈکہ سے بڑھ کر جلال آباد پر قابض ہو جائیں گی۔ وہاں زیادہ فوج بھی نہ تھی۔ محاذ سے فرار ہونے والے کابل یا اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ ایسے وقت خام خیالی نے عوام کو ہراساں کر دیا۔ اور افواہیں پھیلنا شروع ہو گئیں کہ جلال آباد پر حملہ ہونے والا ہے۔ چند خود غرض اور نادان دوستوں نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ اسے جلا دیا جائے تاکہ دشمن اگر قابض بھی ہو جائے تو کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے اور ارد گرد کے قبائلی جو کچھ افواہوں سے متاثر تھے اور کچھ افواہوں کو بڑھا چڑھا کر پھیلاتے تھے اس لالچ میں مبتلا ہو گئے اور جلال آباد کو لوٹ کر جلا دیا گیا۔ اس کا نتیجہ شبقدر کے محاذ پر یہ ہوا کہ

اسلام پور باچا جو خود بڑا غازی مرد تھا اس کو یہ تاثر دیا گیا کہ جلال آباد کو لوٹنے والے بڑھ رہے ہیں اور اسلام پور کو جو جلال آباد سے چھ سات گھنٹے کی پیدل مسافت بر لب سڑک (دریائے کنڑ پر واقع ہے) لوٹ لیا جانے والا ہے۔ باچائے موصوف اپنے گھر کو بچانے کے خیال سے اور افغانی فوجیں خوف کی وجہ سے محاذ کو چھوڑ کر بھاگ نکلیں۔ ان کا اسلحہ مہمند اور باجوڑ کے قبائلیوں نے چھین لیا اور قبائلی بھی محاذ چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ چند مجاہدین اور حضرت ملاں بابڑہ اور ان کے کچھ معتقد میدان میں رہ گئے اور یہ محاذ بھی جلال آباد کی سراسیمگی کی نذر ہو گیا۔

ملا چکنور کی دلیری

ڈکہ پر ملائے چکنور دیوار آہنی کی مانند ڈٹے رہے۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرنگی نے جو پہلی جنگ عظیم سے مضمحل ہو چکا ہوا تھا۔ جنگ کو طول دینے کی بجائے افغانستان کی آزادی کو تسلیم کر لیا۔ اور افغانستان کی طرف سے پہلی دفعہ آزاد افغانستان کا ایک وفد علی احمد خان برادر نسبتی (بہنوئی) غازی امان اللہ خان کی سرکردگی میں ہندوستان میں وارد ہوا۔ مجھے یاد ہے کہ بعض واقف کار افغانی وزیر خزانہ کی اس وفد میں موجودگی کو یہ معنی دیتے تھے کہ افغانستان فرنگیوں سے تاوان جنگ کے نام پر مال اینٹھنے آیا ہے اس وزیر خزانہ کی آمد کو فرنگیوں کی کمزوری اور افغانستان کی فتح کی دلیل قرار دیا جا رہا تھا۔ مگر یہ وفد کچھ ناکام سمجھا گیا۔ کیونکہ سردار علی احمد جان نے تو طوعاً و کرہاً فرنگی کی چرنی زنگی کو دینا مان لیا تھا۔ نتیجتہً سردار موصوف کو کئی سال کے لیے خانہ نشین کر دیا گیا اور دوسرا وفد سردار محمود طرزی افغانستان کے وزیر خارجہ (امیر امان اللہ خان کے خسر) کی زیر سرکردگی راولپنڈی میں آیا۔ بہر حال افغانستان اب ایک آزاد مملکت کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اس کے بعد فرنگیوں نے ریشہ بازی شروع کر دی۔ جس کا ذکر اپنے مقام پر ہوگا۔

امان اللہ خان کے اقدامات

امان اللہ خان نے فرصت پاکر اپنے محلوں کو ان تین سو لونڈیوں سے پاک کیا جو ان کے والد امیر حبیب اللہ خان نے اپنی عیاشی کی غرض سے مختلف قبائل سے جمع کر رکھی تھیں اور مملکت کے انتظام کے لیے انتظامیہ کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا۔ اس عنصر کو جو امیر حبیب اللہ کی فرنگی دوستی کی وجہ سے برسر اقتدار آیا تھا یکسر نکال دیا جن کو وہ شہزادگی کے زمانہ میں جان گیا تھا اور اپنے ڈھب کے لوگوں کو آگے لے آیا۔ اپنے خسر کو جو شام میں اخبار نویس کی حیثیت سے مقیم تھے افغانستان بلا کر وزیر خارجہ مقرر کیا اور نادر خان کو جو ملک کا ایک کامیاب جرنیل ثابت ہوا تھا، سپہ سالار افواج مقرر کر کے سمت مشرقی جلال آباد کا گورنر بھی مقرر کیا۔ تاکہ انگریزوں کو یہ معلوم رہے کہ مشرقی سرحد جہاں انگریزوں کی شمالی سرحد ملتی ہے۔ ایک طاقت ور جرنیل کی حفاظت میں ہے۔ آغا ہاشم کو وزیر مال مقرر کیا احمد علی خان جو بچہ سقا کی قوم سے تھا کابل میں افواج کا جرنیل مقرر کیا جسے بعد میں افغانی طلبا کا نگران بنا کر بھیجا تاکہ یورپ سے نئے تجربے کر کے ملک کو فائدہ پہنچائے۔

بین الاقوامی حالات

سردار فیض جان کو جو نادر خان کے چچازاد بھائی تھے وزیر تعلیم مقرر کیا اور عبدالہادی خان کو کچھ عرصہ یورپ کا دورہ کرا کے وزیر تجارت لگایا۔ نادر خان کے چھوٹے بھائی شاہ ولی خان کو جو امان اللہ خان کا بہنوئی بھی تھا۔ لندن میں سفیر مقرر کیا۔ جنرل شاہ محمود نادر خان کے دوسرے چھوٹے بھائی اور اپنے بہنوئی کو سمت جنوبی خوست میں گورنر مقرر کیا۔ صالح محمد کو پہلی وفاداری کے صلے میں غالباً ہرات کا گورنر بنا دیا گیا ولی محمد خان کے یورپ جانے کے بعد جنرل نادر خان کو مرکز میں بلا کر وزیر جنگ بنا دیا اور ان کے برادر ہاشم خان کو جو نادر خان کے بعد سب سے بڑے اور جری جرنیل تھے سمت مشرقی جلال آباد کا گورنر بنا دیا[1]۔ غرض امان اللہ خان نے اپنی جانب سے جاندار انتظامیہ بنا کر ملک کو مضبوط کر لیا تھا۔ [1] حاشیہ برنجہ آئندہ

ہر قابل ذکر بڑے ملک میں اپنی سفارتیں قائم کیں اور کئی سفارتیں افغانستان میں قائم ہو گئیں۔ یہ وہ عہد تھا جب روس یقین کی سرگرمی میں بخارا کو ہڑپ کر کے دریائے جیحوں کے پار افغانستان سے آملا تھا۔ اور مرد بیمار ترکی مصطفےٰ کمال کی قیادت میں سنبھالا لے رہا تھا۔ ایران میں رضا شاہ کبیر بھی اپنی قوت مضبوط کر رہا تھا۔ تھکا ہوا جرمنی قیصر کی ہاری ہوئی بازی کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ برطانیہ اگرچہ ہارا نہیں تھا۔ مگر نئے ابھرتے ہوئے امریکہ سے دوسرے نمبر پر آچکا تھا۔ پیرس اپنے زخموں کو اندمال کی کوشش میں مصروف تھا جو جرمنی نے اسے پہنچائے تھے۔ یہی حال اٹلی کا تھا۔ غرض ہر ملک اپنی جگہ اپنی زائل شدہ قوت کو بحال کرنے میں مصروف تھا۔

مولانا بشیرؒ کی تربیت کا فیض

امان اللہ خان شہزادگی میں مولانا سے مملکت کو سنبھالنے کی تربیت سے فیض یاب ہو چکا تھا۔ اس کا مظاہرہ اس سے مملکت کی باگ ڈور سنبھالتے ہی کر دکھایا تھا۔ مولانا بشیرؒ سب کچھ آنکھوں سے دیکھتے اور اپنی محنت کے بار یاب ہونے پر شکر الٰہی بجا لاتے، وہ بہت ہی خوش ہوتے تھے کہ کل کے غلام اپنی آزادی کی بحالی کے لیے کوشاں ہیں۔

فرنگی شیطنت

فرنگی یہ دیکھ کر از روئے حسد جل بھن رہے تھے اور بڑی گہری نظر سے مطالعہ کر رہے تھے۔ ان کی شیطنت نے انہیں آزمایا ہوا حربہ آزمانے کے لیے اکسایا۔ افغانستان کے ساتھ جھڑپ میں وہ دیکھ چکے تھے کہ امان اللہ خان کے ساتھیوں میں نادر خان ایک طاقتور بازو اور اچھا نائب ثابت ہو چکا تھا۔ چنانچہ امان اللہ خان سے نادر خان کو چھین لینے

۱؎ حاشیہ سابقہ صفحہ۔ اٹلی میں شیر محمد خان سفارت کے لیے جا چکے تھے۔ ترکی کے مشہور فوجی افسر ضیاء اور بدری بے اور جمال پاشا اس وقت افغانستان کی حربی رہنمائی میں مصروف تھے۔

کے لیے ایک خاکہ تیار کیا۔ وہ نادر خان کو کسی قیمت پر خرید نہ سکتے تھے۔ وہ بکاؤ مال تھا ہی نہیں اس لیے انہوں نے نادر خان کو چھوڑ کر انتظامیہ کے قابل ذکر اراکین کو خریدنا شروع کیا۔ وہ شخصی حکومتوں کی اس کمزوری سے بارہا فائدہ اٹھا چکے تھے۔ عموماً ہر بادشاہ شخصیت پسند ہوتا ہے امان اللہ خان ایک اچھا بادشاہ ضرور تھا۔ مگر وہ اس کمزوری سے مبرا نہ تھا۔ دشمن نے امان اللہ خان کی کمزوری کو چرکے لگا کر اور کمزور کر دیا۔ شیطان جب کسی کو پھانسنا چاہتا ہے تو پہلے اس کی انا کو بڑھاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے سفیروں کے ذریعے امان اللہ خان کی نام پیدا کرنے اور نام چھوڑنے کی ہوس کو ابھارا۔ اس غرض کے لیے ایک انگریز اور ایک سکھ انجنیر کو امان اللہ خان کے نزدیک کیا اور انہوں نے ملک کو نہیں بلکہ امان اللہ خان کو اس کا ذاتی نام ابھارنے کی ترغیب دینا شروع کی۔ اور ابتدا میں چند چھوٹے چھوٹے کام عام اصلاحی صورت میں انجام پائے۔ جب امان اللہ خان پوری طرح اس ہوس کا اسیر ہو گیا تو ایک شہر دارالامان کی داغ بیل ڈالنے کی طرف متوجہ کیا۔ تاکہ امان اللہ اپنے نام کو باقی رکھنے کی ہوس میں ملک کے خزانے کو بری طرح اڑائے اور اس کام کے لیے جو نقشہ تیار کیا گیا اس پر چار کروڑ روپے کا اندازہ لگایا گیا۔ اور وزرا اور امراء کی کوٹھیوں پر ان کا بھی کروڑوں روپیہ صرف ہوتا۔ اس وقت زر خرید کارندوں کے ذریعے بھی امان اللہ خان کو اس کام پر ابھارنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی اپنے کارندوں کے ذریعے جو بادشاہ کو ابھار کر دلاسا دے رہے تھے، نادر خان کو بھی شیشے میں اتارنے کی کوشش کی اور اسے بادشاہ کی فضول خرچی اور نام نمود کی ہوس کا نشان دیا۔ نادر خان بہت سلجھی طبیعت کے مالک تھے وہ خاموش رہے یار لوگوں نے اس خاموشی کو مخالفت کے معنی پہنا کر امان اللہ خان کو ورغلانا شروع کر دیا اور امان اللہ خان کو نادر خان ایک ہوا بنا کر دکھلانا شروع کر دیا۔ حتٰے کہ امان اللہ خان نے نادر خان کو پوچھ ہی لیا کہ کیا آپ مجھ سے خفا ہیں۔ نادر خان نے پوری صفائی پیش کر دی۔ مگر دشمن تو اپنا جال خوب پھیلا چکے تھے۔ نادر خان کی صفائی کو بھی منافقت قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ انہوں نے ایک تجویز پیش کی کہ اگر نادر خان صاف دل ہے تو اس کا امتحان

کچھ مشکل نہیں۔ اور امتحان کی تجویز یہ قرار پائی کہ اعلیٰ حضرت کچھ عرصہ کے لیے چھٹی لے لیں۔ اس دوران افغانستان کے دستور کے مطابق نادر خان ہی قائم مقام ہوں گے۔ اس وقت شہر کا نقشہ قائم مقام کو پیش کیا جائے اور اسے منظوری کے لیے دیا جائے۔ اگر وہ منظوری دے دے تو امان اللہ خان سے ملک کے خالی کرنے کا الزام بھی ٹل جائے گا۔ اگر اس نے منظور کر لیا تو وقت آنے پر الزام تھوپا جا سکتا ہے کہ اعلیٰ حضرت تو چھٹی پر تھے قائم مقام کو ملک کی بہتری کو مدنظر رکھنا چاہیے تھا۔ اس نے اپنی پاور سے بڑھ کر اختیارات کا استعمال کیا اور ملک کو نقصان پہنچایا اور اگر اس نے منظوری نہ دی تو پھر بھی اپنا الو سیدھا ہوگا اور تیر میں نشانے پر بیٹھے گا۔ چنانچہ اس تجویز کو امان اللہ خان لے کر قندھار جا بیٹھا اور یار لوگوں نے قائم مقام کی حیثیت سے نقشہ منظوری کے لیے پیش کر دیا۔ آغا ہاشم نے نقشہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اعلیحضرت کی رخصت سے پہلے نقشہ تیار نہ ہو سکا تھا اور اعلیٰ حضرت کی خواہش تھی کہ کام جلدی شروع ہو سکے اب آپ جب کہ قانونی طور پر بادشاہ ہیں اس لیے آپ منظوری عطا کر دیں۔ تاکہ کام جلدی شروع کیا جا سکے۔

امان اللہ اور نادر خان کی چشمک

نادر خان اس جال سے واقف ہو چکا تھا پھر بھی اس نے مختصر جواب دے کر منظوری دینے سے معذوری کا اظہار کر دیا اور کہا کہ افغانستان ایک نوآزاد کمزور ملک ہے اس کے بہت سے کام ادھورے پڑے ہیں۔ بے شمار ضرورتیں ہیں۔ تعلیم میں ملک بہت پیچھے ہے۔ نہریں آبپاشی کے لیے سڑکیں آمد و رفت کے لیے بنانے کی ضرورت ہے فوج ہماری اسلحہ کے بغیر ہے۔ اس لیے میں یہ کام کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اعلیٰ حضرت آنے ہی والے ہیں۔ یا یہ کاغذات ان کو بھیج کر ان سے اجازت حاصل کر لی جا سکتی ہے میں منظوری دینے کی پوزیشن میں نہیں یہ کام بہت بڑا ہے۔ یاروں کا مقصد حل ہو چکا تھا جب امان اللہ خان واپس آیا تو اس کو یہ خبر خوب مصالحہ لگا کر دی گئی اور ساتھ ہی یہ حاشیہ بھی لگا دیا گیا کہ اس نے کہا تھا کہ قوم کے خزانے کو برباد کر کے قوم کی نظروں سے

کرنا نہیں چاہتا۔ امان اللہ خان کو یہ فقرہ کھٹکنے لگا کہ نادر خان اس کوشش میں ہے کہ میں امان اللہ خان سے حکومت چھین لوں گا۔ شخصی حاکم کی سب سے بڑی کمزوری جو امان اللہ خان میں اس کے نادان دوستوں یا دانا دشمنوں نے اجاگر کر دی تھی۔ بر وئے کار آ رہی تھی۔ اب حالت یہ ہو گئی تھی کہ امان اللہ خان کو متواتر ڈرایا جاتا مگر نادر خان کا تحمل بڑا کارگر ثابت ہوا۔ نفاق ڈالنے کی یہ چال حسب منشا کامیاب نہ ہوتی نظر آ رہی تھی۔[۵]

خطرناک تجویز

اس وقت نئی خطرناک تجویز زیر عمل لائی گئی۔ نادر خان عام طور پر شام کو گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کو نکلا کرتا تھا۔ حسب معمول وہ سیر میں مصروف تھا اسے کوئی وہم بھی نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے کہ اچانک ایک کار کا تصادم اس کے ساتھ ہوا۔ تصادم اتنا ہولناک تھا کہ نادر خان بہت زیادہ زخمی ہو کر گر پڑا۔ اسے ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ اور اخبار میں نادر خان کے سخت زخمی ہونے کے شائع ہو گئی۔ ہمیں اخبار باقاعدہ آتا تھا۔ یہ خبر جب میں نے پڑھی تو اخبار لے کر حضرت مولانا بشیرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اخبار پڑھ کر مولانا کے منہ سے بے اختیار نکل گیا کہ شاید افغانستان کے برے دن آنے والے ہیں۔ میں چونکہ ان کے زیر تربیت تھا۔ میں نے عرض کی کہ ایک کے حادثہ سے اگرچہ وہ کتنا بڑا آدمی ہو ملک کے برے دن آنا مجھ سے باہر ہے۔ آپ نے فرمایا عبدالکریم اور انہوں نے نہایت کرب کے ساتھ مجھے اس راز سے آگاہ کیا جو میں نقل کر رہا ہوں مجھے اتنی واقفیت نہ تھی۔ مولانا نے مزید فرمایا کہ اس تصادم کے نتیجے میں جو عمداً کیا گیا ہے۔

۵۔ میں چونکہ اکثر کابل یا جلال آباد جاتا رہتا تھا۔ پورا راز تو نہیں مگر نادر خان کے بعض حامیوں کو یہ کہتے سنا کہ امان اللہ خان نادر خان سے منافقت برت رہا ہے اور ایک سرکاری افسر جو افغانستان کے پریس میں ذمہ دار حیثیت رکھتا تھا یہ کہتے سنا کہ ہم جانتے ہیں کہ نادر خان بہت خوبیوں کا مالک ہے مگر اس کا کیا علاج کہ وہ ہمیں پسند نہیں۔

دونوں صورتوں میں دشمن کی کامیابی ہو گی۔ اگر خدانخواستہ خان صاحب جانبر نہ ہو سکے تو بھی دشمن کا مقصد پورا ہو گیا۔ امان اللہ خان ایک مخلص بازو سے محروم ہو گیا اور اگر وہ اس صدمہ جانکاہ سے بچ نکلا، تو بھی دشمنوں کا مقصد پورا ہوتا نظر آتا ہے وہ یوں کہ آنا شدید زخمی لامحالہ کافی مدت تک ہسپتال میں رہے گا اور اس عرصے میں وہ شیطان جنہوں نے جال پھیلا رکھا ہے امان اللہ کو حسب سابق ورغلاتے اور بدظن کرتے رہیں گے اور نادر خان جو فتنہ کا غبار ایک ملاقات میں دھو دیا کرتا تھا اس سے محروم رہے گا۔ امان اللہ جس مرحلے پر پہنچ چکا ہے اس سے غبار آلود ہوتا ہے گا۔ نتیجہ وہی ہو گا کہ امان اللہ خان اس غلط فہمی کا شکار ہو کر اپنے دوست سے محروم ہو جائے گا جو دشمن کا اصلی مقصد ہے۔ جس کے لیے دشمن نے یہ جال پھیلایا ہے۔

نادر خان کا استعفیٰ!

نادر خان اس حادثہ کی وجہ سے چھ ماہ ہسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش سے جانبر ہو کر نکلا۔ ان کا جانشین ان کا بھائی ہاشم خان کو کیا گیا تھا مگر حاسدوں نے ایک حرف بھی اس کے خلاف حرف شکایت نہ کہا بلکہ حسب سابق نادر خان کے خلاف امان اللہ خان کو اکساتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امان اللہ خان اتنا بدل چکا تھا کہ اس نے اس کا بھی انتظار نہیں کیا کہ نادر خان کاروبار مملکت کے سلسلہ میں خود حاضر ہو بلکہ ادھر نادر خان نے وزارت دفاع کے دفتر میں حاضر ہو کر اپنے جانشین سے چارج کیا۔ ادھر امان اللہ خان وزنامہ ۔۔۔ یں پہنچ گیا۔ نادر خان ایک سمجھدار اور باغیرت شخص تھا۔ اس نے امان اللہ خان کی اس آمد اور چہرے کے اطوار کو بغور دیکھا۔ اس نے صفائی بے کار سمجھی وہیں استعفیٰ دیا جو اسی وقت منظور کر لیا گیا نادر خان گھر کو سدھارے۔ مولانا کی بات بالکل صحیح ثابت ہوئی۔

سیاسی کشمکشوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک سیاسی آدمی جب تک کوئی اقدام نہیں کر چکتا وہ نتیجے سے بے پرواہ رہتا ہے۔ مگر حالات و واقعات نہ دریا

بدترین سیاسی بے تدبیری کے نتیجے کو سامنے لاکر رہتے ہیں۔ یہی اس معاملہ میں بھی ہوا۔ اگرچہ امان اللہ خان نے ولی محمد خان کو وزیر حربیہ نامزد کر دیا۔ مگر نادر خان کی اہمیت نے اس کو جلد ہی اپنی چوک سے آگاہ کر دیا۔

پیرس میں سفارت

نادر خان کی نزدیکی رشتہ داری تھی۔ اس کی ایک سوتیلی ماں، نادر خان کی بہن تھی۔ یوں بھی اس کا مخلص دوست یا رہ دار سرتی تھا نیز اس کے دو سگے بھائی امان اللہ خان کے بہنوئی اور دونوں نہایت اہم عہدوں پر فائز تھے تیسرا بھائی بھی امان اللہ خان کے تمام حوالوں سے بنتر تھا۔ ایسی حالت میں امان اللہ خان کتنی دیر خاموش رہ سکتا تھا۔ چنانچہ اس واقعہ کے تیسرے دن امان اللہ خان نادر خان کے مکان پر پہنچا۔ اس سے معذرت چاہی اور کہا کہ بات یہ ہے کہ وزارت کے دوسرے وزراء جو یورپ یاترا سے مشرف ہو چکے ہیں۔ وہ ہمیشہ مجھے طعن دیا کرتے تھے کہ آپ نے ایک جرنیل کو ہم پر مسلط کر رکھا ہے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ آپ بھی یورپ ہو آئیں اور فی الحال پیرس میں سفارت قبول کر لیں۔

ایک اور چرکہ

اس تقریر کو سن کر نادر خان کے دل سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا۔ کیونکہ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آخر حاکم اس مقام تک جہاں امان اللہ خان پہنچ چکا ہے۔ اتر آئے تو اس سے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔ وہ جو کچھ بھی کر گذرے کم ہے۔ چنانچہ بخوشی پیشکش قبول کر لی گئی۔ اگرچہ اس کے ایک جرنیل کی ماتحتی کا بھی دھڑکا تھا۔ بہر حال جان بچی لاکھوں پائے والا معاملہ رہے۔ بہت جلد نادر خان نے کوچ کی تیاری کر لی۔ دشمن نے امان اللہ خان کے لیے ایک اور زبردست چرکہ جو تیار کر رکھا تھا عین اس وقت اس کو بروئے کار لایا جب نادر خان نے کوچ کی تیاری کر لی۔ ابھی وہ پشاور

ہی پہنچا تھا۔ اگست ۱۹۲۶ء میں بغاوت اس دن شروع کرائی گئی اور اپنے زر خریدوں کے ذریعہ پھیلوایا گیا۔ کہ دیکھا جاتے جاتے بغاوت بھی کرا گئے۔ دشمن کی چالاکی بھی قابل داد ہے کہ جو قبیلہ نادر خان سے بہت وابستہ تھا جس کی شجاعت نے فرنگی سے چھینا تھا یعنی شنکل قبیلہ اس اہم فرض کے لیے چنا گیا تاکہ امان اللہ خان کو فرضی سازش کا یقین آ جائے۔

بغاوت اس کے عوامل اور اسباب میں پھر لکھوں گا۔ اس مقام پر ایک دو واقعات ۱۹۲۴ء کے اوائل میں رونما ہوئے بیان کرتا ہوں۔

عجب خان آفریدی

یہ واقعہ ۱۹۲۴ء کے ابتداء کا ہے۔ اس واقعہ کا تعلق عجب خان سے ہے جس کے متعلق پاکستان میں کچھ جھوٹی سچی فلم بھی دکھائی جا چکی ہے۔ وہ فلم تو میں باوجود خواہش نہ دیکھ سکا۔ مگر کا جہاں تک تعلق ہے۔ فلم میں پلاٹ کافی غلط طور پر پیش کیا گیا۔ جہاں تک مجھے علم ہے میں نقل کرتا ہوں۔

اس واقعہ کا پس منظر فرنگی کی اس پالیسی سے وابستہ ہے جو وہ آزاد سرحد کے غیور باشندوں کو اسلحہ سے تہی دست کرنے کے لیے اختیار کیا کرتا تھا۔ وہ اپنے اہل کاروں کو سوداگر کے روپ میں اس علاقہ میں پھیلاتا جو اسلحہ کی خرید و فروخت کرتے مگر اس کا مقصد کچھ تو علاقہ کے حالات معلوم کرنا ہوتا اور کچھ اسلحہ کی خرید ہوتا۔ فروخت کرنا نہیں۔ اگر کوئی اسلحہ خریدنا چاہتا تو اس کو وہ اتنی زیادہ قیمت بتاتے جو علاقہ کے عام نرخ سے زیادہ ہوتا۔ خریدار کہتا کہ یہاں یہ نرخ نہیں وہ کہتے جو نرخ کہتے ہیں اس پر خود خریدنے کو تیار ہیں۔ خریدار اپنا اسلحہ اس خیال سے بیچنے کو تیار ہو جاتا کہ چلو اب قیمت زیادہ ملتی ہے بیچ دیتے ہیں ہم کم دام پر جو عام نرخ ہے خرید لیں گے۔ مگر جب وہ بیچ کر اور خریدنے کی کوشش کرتا تو اسلحہ بہت کمیاب ہوتا بلکہ جس قیمت پر اس نے اپنا اسلحہ فروخت کیا تھا اس قیمت پر بھی نہ ملتا۔ کیونکہ اسی طرح لالچ میں اکثر اپنے اسلحہ سے تہی دست ہو چکے ہوتے اسی کمی کو بعض ہمت آنا

کر کے انگریزی چھاؤنیوں یا چوکیوں پر شبخون مار کر پورا کرتے عجب خان ایسے ہی من چلوں میں سے ایک تھا۔

عجب خان کا ڈاکہ

اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے عجب خان نے کوہاٹ کوتل پر ڈاکہ ڈالا اور تیس بندوقیں لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا ناکام تعاقب کیا گیا مگر وہ بچ کر نکل گیا۔ کئی مہینے اس کے انتقام کی آگ میں سلگنے کے بعد ایک دن چھاؤنی میں اطلاع ملی کہ آج شب عجب خان اپنے مقام پر نہیں ہو گا۔ اس مہم کے لیے ایک شقی القلب فرنگی افسر کو تین سو مسلح سکھ فوجیوں کے ہمراہ روانہ کیا گیا۔ عجب خان کا گاؤں آزاد سرحد میں کوہاٹ سے کوئی گیارہ بارہ میل پر تھا۔ یہ لوگ آدھی رات کے بعد اس کی بستی میں داخل ہوئے جو اپنی دھاک کے زعم میں غافل سو رہے تھے۔ عجب خان کے کل چودہ پندرہ مزارع اور وہی اس کی کل کائنات تھی وہ بھی فرنگی کی خوش قسمتی سے غافل سو رہے تھے۔ ان بہادروں نے عجب خان کے مٹھی بھر ساتھیوں کو سوتے میں جا پکڑا اور مردوں کو گرفتار کیا اور عورتوں کی توہین و تذلیل کی اور عجب خان کا تمام اسلحہ اور مال و اسباب لوٹ کر واپس آ گئے۔

مس ایلیس کا اغواء:

عجب خان جب واپس لوٹا تو اس نے اپنی بربادی کو صبر کے گھونٹ پی کر برداشت کیا۔ ایک کمینہ اور سفاک دشمن سے نیکی کی توقع فضول تھی۔ اس نے اس حرکت کے جواب میں ایک تہدید آمیز چٹھی لکھی اور اپنے ساتھیوں کی آزادی کا مطالبہ کیا۔ ایک طاقتور دشمن حکومت ایک ایسے شخص (جس کے سارے ساتھی اس کے قبضے میں تھے) کی دھمکی کی کیا وقعت سمجھتی تھی۔ ایسی حالت میں عجب اکیلی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر ایک رات پارا چنار میں آ کر ایک انگریز فوجی کپتان اور اس کی بیوی کو قتل کر گیا۔ اس کے بعد اس نے ایک اور چٹھی لکھی اور حکومت کو متنبہ کیا کہ یہ قتل میں نے کیے ہیں۔ اور جب تک آپ میرے ساتھیوں کو رہا نہیں

کر دیتے ایسے ہی حادثے ہوتے رہیں گے اور امن قائم نہیں ہو سکے گا۔
جب اس کا اثر فرنگی کے غرور کی وجہ سے کچھ نہ دیکھا تو پھر اس نے ایک رات ایک مقام پر حملہ کرنے کی دھمکی دی اپنی دھمکی کے مطابق حملہ آور ہوا۔ فرنگی ایک مقام پر اس کے منتظر تھے اور حفاظت کے تحت انتظام کے بھروسے مغرور وہ کچھ ایسے ڈھب سے حملہ آور ہوا کہ دشمن کو اس وقت خبر ہوئی جب وہ مس ایلس ایک انگریز جرنیل مسٹر ایلس کی لڑکی اغوا اور مسز ایلس کو قتل کر کے دشمن کی زد سے نکل چکا تھا۔ ممکن ہے کہ اس واقعہ کے جاننے والے اب بھی کافی لوگ موجود ہوں اور ان کو یاد ہو کہ اس حادثہ کے بعد لندن میں انگریز خواتین نے پارلیمنٹ کے باہر زبردست مظاہرے کیے اور حکومت کو کوسنے دیے کہ تم اتنی بڑی حکومت رکھتے ہوئے اپنی قوم کی خواتین کی حفاظت نہیں کر سکتے اور ایک ڈاکو کو تم مطلع کر کے ایک عورت کو قتل اور نوجوان لڑکی کو اٹھا کر لے جاتا ہے۔

عجیب خان کی شرائط

اب فرنگیوں کو ہوش آئی اور تیراہ میں با اثر افراد کے ذریعہ عجیب خان سے لڑکی کی رہائی کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کی گئی۔ عجیب خان نے ان با اثر افراد کو سمجھایا کہ فرنگی کی اس پالیسی کے جواب میں کوہاٹ میں ڈاکہ ڈالا گیا تھا جس کے ذریعے وہ اپنی دولت کے بل پر ہمارے بے خبر بھائیوں سے اسلحہ خرید کر ہمیں تہی دست کر دیتا ہے۔ اگر وہ امن کے اتنے ہی پجاری ہیں تو ہمارے علاقہ میں ریشہ دوانیاں کرنے سے کیوں نہیں باز آتے۔ پھر جب میں نے کوہاٹ سے بندوقیں حاصل کر کے اپنے علاقے کی کمی کو پورا کیا تھا اس وقت انہوں نے آپ لوگوں کو یاد کرنے کی بجائے اپنی طاقت کے زعم میں میری عدم موجودگی میں تین سو بہادروں کی فوج لے کر میرے مٹھی بھر آدمیوں کو گرفتار اور میرا اسلحہ اور تمام سامان لوٹ کر لے گئے اور میرے بار بار جھنجھوڑتے چٹھیاں لکھنے کے باوجود میرے ساتھیوں کو رہا نہ کیا۔ اب آپ نتائج پر مطمئن ہیں تو میں ان شرطوں پر مس ایلس کو جو میرے پاس ایک پاک امانت کی حیثیت سے محبوس ہے۔ واپس کرنے کو تیار ہوں۔

میری پہلی شرط یہ ہے کہ آئندہ فرنگی ہمارے علاقے سے اسلحہ خرید کر ہمیں تہی دست کرنے کی پالیسی سے دست کش رہے۔ آخر اس کو کونسی ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ ہم سے اسلحہ خریدتا ہے۔ عجیب کہ ہمارے پاس جو اسلحہ ہوتا ہے وہ انہیں کے کارخانوں میں تیار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کو اسلحہ کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ ہمیں نہتہ اور اپاہج کرنے کے لیے یہ حرکت کرتا ہے جو ناقابل برداشت ہے اور اسی وجہ سے یہ سارے واقعات رونما ہوئے ہیں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ میرے ساتھیوں کو رہا کر دیا جائے اور ساتھ ہی میرا اسلحہ اور سامان واپس کیا جائے اور یہ جوان کی ہٹ اور ضد کی وجہ سے مجھے تین حادثے کرنے کی تکلیف برداشت کرنا پڑی ہے اس کے ہرجانے کے طور پر مجھے بارہ ہزار روپیہ نقد تاوان ادا کیا جائے۔

ان ذلت آمیز شرائط کو قبول کرنا نہایت ہتک سمجھتے ہوئے فرنگی نے اور کئی وسائل اختیار کیے۔ کبھی ملا اخوند زادہ کے پاس فریادی ہوئے اور کبھی تیراہ کے بے تاج بادشاہ ملاں اکاخیل کو پشتو کا واسطہ دیا۔ مگر عجب خان کے موقف کو کوئی طاقت شکست نہ دے سکی۔ اور وہ اپنے مطالبات پر ڈٹا رہا۔

ہر چہ دانا کند کند نادان
لیک بعد از خرابی بسیار

مس ایلیس کی رہائی

آخر چاروں طرف سے مجبور ہو کر اس کے مطالبات کو بہزار ذلت قبول کرنا پڑا اور پشتون جرگہ کے واسطے سے عجب خان کے مطالبے کو ماننا پڑا۔ اس طرح مس ایلیس رہا ہو کر واپس آگئی۔ اس مقام پر پشتو کی اس خوبی کی داد دینا پڑتی ہے جو اسلام کی برکت اور اسلام کی اطاعت کی شکل میں رواج پذیر ہے سیاسی اغراض سے اغوا شدہ عورت کی عصمت وعفت کی حفاظت کی جاتی ہے اور مس ایلیس جو ایک جوان اور حسین

دوشیزہ تھی اس نے قسم اٹھا کر اپنی عصمت کی حفاظت کا اقرار کیا جب کہ کئی ہفتے عجب خان کے نیضے میں رہی تھی اور وہ انتقام کی آگ میں سلگتا رہا مگر دوشیزہ کی عصمت کو داغدار ہونے سے بچائے رکھا۔

افغانستان کے اسلحے کی بازیابی

یہ وہ زمانہ ہے جب نادر خان صاحب ہسپتال میں صاحب فراش تھے اور دوسری طرف سے امان اللہ خان کی حکومت نے اٹلی کے آغا شیر محمد خان کے توسط سے فرانس سے دو کروڑ روپے کا اسلحہ خریدا تھا (یہ روپیہ نادر خان کی بروقت احتیاط کی وجہ سے جب کہ اس نے دار الامان کی منظوری دینے سے معذوری ظاہر کی تھی اسلحہ پر خرچ ہو رہا تھا) مگر فرنگی جیسا زیرک دشمن اس کمزور ہمسائے کی اس جسارت کو کب معاف کرنے والا تھا۔ جب کہ وہ اس کے خلاف کینہ پن کی وجہ سے سازشوں کے جال پھیلا رہا تھا۔ چنانچہ گو معاہدے کی رو سے فرنگی اس اسلحہ کو کراچی سے پشاور پہنچانے کا مکلف تھا مگر فطرت ہی جس کی مسخ ہو چکی ہو وہ معاہدوں کا کب پابند ہوتا ہے اس بنا پر فرنگیوں نے ٹال مٹول سے کام لے کر اسلحہ کراچی میں روک کے رکھا۔ امان اللہ خان اپنا اسلحہ حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے فرنگیوں نے امان اللہ خان کو ایک کڑی آزمائش سے دوچار کر دیا اور اس نے کہا کہ تم یاغستان کو اپنا قومی علاقہ کہا کرتے ہو۔ ہمیں عجب خان کے شر سے نجات نہیں دلا سکتے۔ دراصل فرنگی اپنی سرحد کے قریب عجب خان جیسے غیور اور جری کو برداشت نہیں کر سکتے تھے انہوں نے امان اللہ خان کو اس کے دعویٰ کے مطابق (جس کا ذکر جنگ وزیرستان کے ذکر میں آئیگا جو مولانا بشیر اور انگریزوں کے درمیان ۱۹۲۰ء سے شروع تھی۔ مگر اب بوجوہ سرد تھی) یہ پہلی سہ ماہی ۱۹۲۶ء کے اختتام کے دن تھے۔ فرنگیوں نے امان اللہ خان کو تجویز بھی خود ہی بتادی کہ اس کو روس کی سرحد کے قریب کوئی جاگیر دے دے تو ہم اسلحہ چھوڑ دیں گے۔ اسی موقعہ پر فرنگیوں نے دوشنو اریوں کو بھی مانگا تھا۔ جن پہ ایک انگریز انجنیر

کے قتل کا الزام تھا۔ قتل کے بعد ابتدا ہی میں فرنگیوں کا مطالبہ یہ تھا کہ ان ملزموں کو ہمارے حوالے کر دو مگر فرنگی کے اس مطالبہ سے امان اللہ کی حکومت نے یہ عذر کر کے جان چھڑا لی تھی کہ وہ جیل سے فرار ہو گئے ہیں۔ مگر عجب خان کے معاملہ میں امان اللہ خان کو کوئی عذر نہیں سوجھتا تھا۔

ایک پیچیدہ صورت حال

اس غرض کے لیے سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ بادشاہ گل حاجی ترنگ زئی کے صاحبزادہ ملوک مہمند کا ایک وفد لے کر امان اللہ خان کی مجبوری ظاہر کر کے پشتو کے رواج کا واسطہ دے کر اس سے سوال کریں کہ وہ اپنی جگہ چھوڑ کر روس کی سرحد پر جاگیر قبول کر لے اور اپنے تمام قبیلے سمیت اپنی نئی جاگیر میں چلا جائے۔ یہ خبر چمرکنڈ میں صاحبزادہ موصوف کے اپنے مقام سے روانہ ہونے سے ایک دن پہلے پہنچی اور چمرکنڈ کے مجاہدین عوام نے جماعت کے اکابرین کو مجبور کیا کہ معاملے پر غور کر کے اس نامعقول مطالبے کو ٹالنے کی صورت کی جائے۔ راقم بھی اس مطالبے میں شریک تھا وہ رات یاد رہے گی کہ مجلس شوریٰ ساری رات غور کرتی رہی۔ ایک طرف افغانستان کی دوستی اور اس سے اسلحہ کی وصولی کی امید دوسری طرف فرنگی کی دشمنی۔ اور قوم کی بے بسی۔ آخر ایک نوجوان نے تجویز پیش کی کہ عجب خان کو چمرکنڈ آنے کی دعوت دی جائے۔ اس صورت میں اپنے زیر اثر قبائل میں سے ہر ایک فرد عجب خان سے فرنگی دشمنی میں کم نہیں اور دلیری اور بہادری اور ایثار میں بھی بفضل خدا یہ لوگ خدا کی رضا کے لیے کام کرنے کی وجہ سے اس سے کم نہیں ہیں۔ اور اس کو سرحد کے قرب کے باعث جو واقفیت ہے اس کو ساتھ لے کر فرنگی پر شب خونوں کے ذریعہ اتنا زچ کر دیا جائے کہ وہ اسلحہ چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ جب کہ ۱۹۲۰ء سے قبل وہ اکیلے عجب خان سے ذلت آمیز شرائط پر مصالحت کر چکا ہے۔

وفد کی روانگی

اس غرض کے لیے راقم کو منتخب کیا گیا۔ میرے ساتھ نوجوان ابوبکر کو صبح روانہ ہو جانے کا حکم دیا گیا۔ مگر ہمیں پابند کر دیا گیا کہ ہم پہلے ملا صاحب چکنور سے ملاقات کر کے ان کو صورت حال اور اپنے پروگرام سے آگاہ کریں۔ مولانا بشیر صاحب نے ایک مختصر سی چٹھی میں ملا صاحب موصوف کو ہمارے ساتھ تعاون اور نیک مشورے سے نوازنے کی خواہش کی تھی۔

عجیب اتفاق ہوا کہ ہمارا اور صاحبزادہ کے وفد کا راستہ ایک مقام بیدمنی کنڈ دریا تک تھا ہم اوپر کی جانب سے اور صاحبزادہ اور ان کے ساتھی نیچے کی جانب بیدمنی کی طرف سفر کر رہے تھے اور اسی مقام پر ہمارا ساتھ ہو گیا اور پورے دو دن ہم سفر رہے جب ہم لوگ اکیلے دو کیلے سفر کرتے تھے تو عام طور پر افغانوں کی مہمان نوازی جانچنے کا موقعہ ملتا تھا۔ مگر اب وفد کے ارکان صاحبزادہ صاحب کے علاوہ بیالیس نفر تھے اور دو نفر ہم اس طرح چوالیس نفر ہم سفر تھے۔ پہلی رات مہمند قبیلہ کے مشہور فرنگی دشمن ملک محصل کے بھائی کے ہاں آئی تھی۔ اور وفد کے ارکان بھی مہمند قبیلہ کی مختلف شاخوں سے ہی متعلق تھے اس لیے اس رات کی مہمانی کچھ تعجب خیز نہ تھی۔ مگر دوسرے دن ہمارا سفر عجیب تھا۔ ہم علی الصباح کھانا کھا کر چلے تھے۔ راستے میں تین بجے تک نہ تو کوئی آبادی تھی اور نہ ہی کہیں پانی کا نام ونشان تھا۔ ایک مقام پر دیکھا کہ ایک کھو کھا نما جگہ پر پانی کے تین گھڑے اور دو پیالے رکھے ہیں۔ ہم سب نے پیاس بجھائی اور آگے روانہ ہو گئے۔ میرے پوچھنے پر ایک ملک نے بتایا کہ یہاں سے دریا چھ میل سے کم نہیں۔ ایک نیک دل شخص جس کا گھر دریا سے تقریباً دو میل دور ہے۔ صبح اپنے گھر سے اٹھتا ہے اور دریا پر پہنچتا ہے۔ پھر پانی کے دو گھڑے راستے کے کنارے پر رکھ کر اپنے گھر واپس چلا جاتا ہے اور تمام گرمیاں وہ اسی طرح پانی اس مقام پر پہنچاتا رہتا ہے۔

پرتکلف مہمانی

پروگرام کے مطابق ہمیں لال پورہ دریائے کابل کے بائیں کنارے ڈکہ کے بالمقابل شب گذارنا تھا۔ ابھی ہم لال پورہ سے تقریباً آدھا فرلانگ دور رہوں گے۔ شام ہو چکی تھی۔ اذان مغرب کا وقت تھا کہ ایک شخص جو تقریباً ستر اسی برس کے درمیان عمر رسیدہ ہوں گے ہمیں ملے۔ میں نے ایک دفعہ جلال آباد میں دیکھا تھا وہ لکڑی کی تجارت کرتے تھے اور دریا ہی کے ذریعے لکڑی اوپر کے پہاڑوں سے لاتے اور پشاور راور راستے کے مقامات پر فروخت کرتے تھے۔ اُن کو حاجی صاحب کہہ کر لوگ یاد کرتے تھے۔ سلام کلام کے بعد گویا ہوئے کہ آپ سب لوگ میرے مہمان ہوں گے۔ رواج کے مطابق ہم بستی میں پہنچ کر بٹ جاتے کوئی ایک کوئی دو کوئی چار افراد کو مہمان بنا کر گھر لے جاتا۔ اور کئی دفعہ ایسے موقعہ پر جھگڑا بھی ہو جاتا ہے۔ مگر بعض باا ثر اور سخی اشخاص کے سامنے کوئی نہیں آتا۔ وہ جس طرح چاہتے ہیں مہمان لے جاتے ہیں۔ دریا کے کنارے ایک بڑی مسجد میں ہم نے ڈیرے ڈالے اور شام عشاء دونوں نمازیں وقت پر ادا کیں۔

حیرت ناک واقعہ

ظاہر ہے کہ پینتالیس مہمانوں کا کھانا ایک جگہ پہلے سے تیار نہ تھا۔ اس کی تیاری کو وقت لگا۔ کافی وقت گذرنے کے بعد کھانا آیا۔ جو پرتکلف ہی تھا۔ رات گذری صبح نماز فجر کے بعد حاجی صاحب پھر پوسے کہ پہاڑی سفر آپ کو درپیش ہے جو بھوکے پیٹ مشکل ہوتا ہے کیونکہ وہاں بازار تو نہیں ہیں اور دن کے بارہ بجے سے پہلے کہیں کھانا دستیاب نہیں ہو سکتا اس لیے آپ ناشتہ کر کے منزل مقصود کو روانہ ہوں ان کا لہجہ ایسا تھا جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ آپ کی مہربانی ہوگی اگر میری درخواست کو قبولیت بخشیں گے۔ دراصل کھانا تیار تھا اور جلد ہی دو، دو پراٹھے ہر ایک فرد کے آگے اور نہایت لذیذ دودھ اور چینی والی سبز چائے حاضر کی گئی۔ جب ہم کھانا کھانے کے بعد رواج کے مطابق ہاتھ

اٹھا کر دعا مانگ رہے تھے تو حاجی صاحب کے معاون کارکنوں میں سے جو کھانا چن رہے تھے ایک شخص گویا ہوا حاجی صاحب کی لڑکی رات کو فوت ہو گئی ہے۔ جنازہ تیار ہے۔ جنازہ پڑھ کر جائیے گا۔ جنازہ لایا گیا فراغت کے بعد اہل وفد کو وہیں سے دریا پار کر کے ڈکہ ہوتے ہوئے اپنی منزل کی طرف جانا تھا۔ یہاں پر میں نے دریا کے پار کے کنارے پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ تقریباً سو، سو گز کے فاصلے پر افغانی سپاہی بندوقیں لیے کھڑے ہیں اور یہ سلسلہ بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ مجھے لال پورہ سے بجانب مغرب گویا دریا کے اُوپر کی جانب ابھی تقریباً ڈھائی میل چاکنور جانا تھا جو دریا کے اسی کنارے واقع ہے جس کنارے لال پورہ۔ میں نے حاجی صاحب کے کارندوں سے کچھ تفاصیل معلوم کرنا چاہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ حاجی صاحب کی جوان دوشیزہ ایک ہی بیٹی تھی جو چند روز سے بیمار تھی۔ گذشتہ شام لڑکی عالم نزع میں تھی۔ طاقت ور لڑکی تھی کوئی لمبی بیماری بھی نہ دیکھی تھی۔ نزع کی تکلیف حاجی صاحب دیکھنا برداشت نہ کر سکے اور اسی عالم میں گھر سے باہر نکل کر دریا کے کنارے ہو گئے اور آپ لوگوں کو دیکھ کر مہمان نوازی کا جذبہ بیدار ہوا۔ اور آپ کو دعوت دے کر گھر میں خبر دی کہ اتنے مہمانوں کے کھانے کا انتظام کیا جائے۔ ماں نے اپنی ممتا مہمانوں کی خدمت کے لیے قربان کر دی۔ کھانے کے انتظام میں مصروف ہو گئی۔ مہمانوں کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد لڑکی نے جان دے دی اور اس کے بعد اس کے غسل و کفن کی تیاری ہونے لگی۔ اس سے فارغ ہو کر مہمانوں کے لیے ناشتہ تیار کرنا شروع ہوا حتیٰ کہ نماز فجر کا وقت ہو گیا اور ناشتے سے پہلے مہمانوں کو خبر نہ ہونے دی تاکہ وہ بھوکے نہ رہیں اور سفر میں مرگ کے صدمہ کے ساتھ بھوک سے تنگ نہ ہوں۔

ملا صاحب چکنور سے مشورہ

ہم دونوں بھائی لال پورے سے چکنور کو روانہ ہوئے، دریا کے کنارے سفر تھا اور دریا کے پار ہم فوج کے پہرے کا نظارہ کرتے رہے۔ حتیٰ کہ چکنور کے سامنے بھی وہی عالم تھا۔ بلکہ بستی کے سامنے کچھ زیادہ سنگین صورت تھی۔ ہم ملاں صاحب موصوف کی خدمت

میں حاضر ہوئے۔ ملاں صاحب نے ہمارے ساتھ نہایت حسن سے اور رنگ مندانہ انداز میں بات چیت کی ماں کو سب باتوں کا علم تھا فرمانے لگے کہ اگر تمہارے پروگرام پر عمل کیا جائے تو خانہ جنگی کا خطرہ ہے۔ اگر تم یہ مول لینے کو تیار ہو تو میں ہر طرح تعاون کروں گا۔ مگر میرا مشورہ ہے کہ اس وقت افغانستان خانہ جنگی کا متحمل نہیں ہو سکتا اور مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے اتفاق کرو گے بس صبر ہی اس وقت اس سدمے کا علاج ہے۔ ان کا جواب مناسب اور جذبات کو دبا کر صبر کی جانب راغب کرنے کے لیے کافی تھا۔ ہم ناکام ہو چکے تھے اور اسی لیے ہم ملاں صاحب سے رخصت خواہ ہوئے اور ایک رات راستے میں گزار کر اگلے دن جلال آباد وارد ہوئے جہاں مولانا بشیر صاحب پہنچ چکے تھے۔ انھوں نے ہمیں یہی حکم دیا تھا کہ اگر ملاں صاحب کا مشورہ نہ ہو تو تم اصرار نہ کرنا اور جلال آباد پہنچ جانا۔ ہم جلال آباد میں ملیں گے۔

احسان کا بدلہ

بادشاہ گل تیراہ اور شنواری اور قبائل کے کچھ اور نمائندے بھی وفد میں شامل کر کے عجب خان کے پاس پشتو کے رواج کے مطابق ایک سوالی کی حیثیت سے پہنچے۔ اس طرح سے سوالی کو رد و قدح کرنے کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ عجب خان نے اپنے آپ کو صاحبزادہ کے حوالے کر دیا اور وہ اسے ہمراہ لے کر کابل پہنچے۔ اس کے بعد فرنگی کو امان اللہ خان کے خلاف بغاوت کے مواد فراہم کرنے کے لیے یکسوئی حاصل ہو گئی اور انہوں نے جلد ہی امان اللہ خان کے اس احسان کا بدلہ چکا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ افغانستان کو سزا دینے کا جو نقشہ تیار کیا گیا تھا بغاوت اسی کی ایک اہم کڑی تھی۔ کیونکہ کسی ملک کو خانہ جنگی سے زیادہ کوئی تحریک بھی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

قادیانی جاسوس

اس کے لیے پروگرام کے مطابق سرحد پر پولیٹیکل عملے میں قادیانیوں کو زیادہ بھرتی کیا گیا جس کے نزدیک امت محمدیہ کا وقت ختم ہو چکا تھا اور اسلام کو نقصان

پہنچانا ان کا مذہبی فریضہ تھا یہی وجہ تھی کہ خلافت اسلامیہ کے سقوط پر قادیانیوں نے چراغاں کر کے خوشی کے شادیانے بجائے تھے اور ایسا کیوں نہ کیا جاتا جب کہ نعمت اللہ اور عبد اللطیف مقتول کا بدلہ لینا اور افغانستان کو انگریز کے پاؤں میں گرانا قادیانیوں کا مقصد تھا یہی لوگ قبائل میں یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ امان اللہ خان بے دین ہو گیا۔ اور پشتو کو ختم کر رہا ہے۔

اس پروپیگنڈے کو تقویت دینے کے لیے ایک قادیانی کابل پہنچایا گیا اور کسی طرح اس قادیانی سے دو کابلی مل گئے جنہوں نے اس زعم میں کہ فرنگی ہمارا پشت پناہ ہے قادیانی ہو جانے کا اعلان کر دیا۔ دوسری طرف انگریزوں کے زرخرید ملاؤں نے طوفان اٹھایا اور امان اللہ خان کی بدنامی کے لیے دو قادیانیوں کے ساتھ ایک نئے مبلغ عنایت اللہ کے مسئلے کو بھی شامل کر لیا گیا پہلے تو امان اللہ خان صرف بے دین تھا۔ اب مرزائی کا خطاب اس کے ساتھ شامل کر دیا گیا۔ اس کے ردعمل میں امان اللہ خان نے تینوں قادیانیوں کو ملاؤں کے فتوٰی کے حوالے سے مرتد قرار دے کر سزائے موت دے دی اور ہندوستان کے قادیانیوں نے بہت شور مچایا اور پولیٹیکل محکمہ کے ملازم مرزائیوں نے مینگل قبیلہ کو اچھی طرح پروپیگنڈے اور زر سے مالا مال کر دیا۔ قبیلہ میں ہتھیار تقسیم کیے گئے۔ یہ قبیلہ عددی قوت اور حرارت کے لحاظ سے بہت طاقتور اور علاقائی لحاظ سے بہت پھیلا ہوا ہے اور اس کی شاخ سلیمان خیل کو کابل کے نواح تک گردیز اتیمور جیسے بہت اہم مقامات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ایسے وقت میں فرنگیوں نے ایک طرف تو یہ خوشخبری دی کہ افغانستان کا اسلحہ آزاد کر دیا گیا۔ چاہیے کہ وہ پشاور تک اپنی یاریداری کا بندوبست کرے اور دوسری طرف میں اس روز جس روز نادر خان عازم یورپ ہو کر پشاور پہنچا۔ بغاوت کا افتتاح کرا کے سارا الزام نادر خان پر تھوپ دیا۔ شاید ان قبائل کو نادر خان کی رسوائی نے بھی تازیانے کا کام دیا ہو۔ مگر خود نادر خان کی خواہش کا ذرا بھی شبہ اس میں نہیں ہو سکتا کہ وہ ایک محب وطن مخلص مسلمان تھا۔ وہ غریب تو چھ ماہ سے ہسپتال میں موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا جس دوران فرنگی نے اپنی سیہ کاریوں سے

بغاوت کا مواد فراہم کیا تھا۔

خانہ جنگی کا آغاز

میں اگست ۱۹۲۴ء سے قبل پولیس اور دیگر وردی والیوں کے ساتھ ساتھ کمنڈیوں کے کارخانے کے روشندان کھڑکیاں اور اسلحہ خانہ کا کچھ کام اور کچھ کمنڈیوں کا کام کر چکا تھا۔ گو چھتیں پڑ چکی تھیں تاہم ابھی ہمیں اور کافی لکڑی کی ضرورت تھی۔ شروع اگست سے میں اور ذوالقرنین بھائی چند ساتھیوں کی معیت میں چمرکنڈ کے شرقی جانب تقریباً ۲½ میل چڑھائی پر کافی اونچی پہاڑی کے دامن میں دیار کی لکڑی کی فراہمی میں مصروف تھے یہ ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ ہم لوگ رات وہیں بسر کرتے صبح و شام کھانا ہمیں پہنچ جاتا۔ غالباً بیس اگست کا دن تھا کہ ہمیں عصر سے قبل چمرکنڈ واپسی کا حکم پہنچا۔ چمرکنڈ پہنچنے پر ہمیں معلوم ہوا کہ افغانستان کے منگل وجدران سلیمان خیلوں نے بغاوت کر دی ہے اور افغانستان کی حمایت کی غرض سے ہمیں اس جنگ میں شامل ہونا ہے۔ خانہ جنگی کو ختم یا مختصر کرنے کی غرض سے جس سے بچنے کے لیے کچھ عرصہ پہلے ہم نے بڑے صبر اور تحمل سے جذبات پر قابو پایا تھا۔

اب ہم سوچ رہے تھے کہ اگر خدا کو منظور ہوتا کہ افغانستان اس مصیبت سے دوچار نہ ہو تو ہمیں عجب خان کے معاملے کا علم اس سے قبل ہو جاتا جب حکومت افغانستان بادشاہ گل کو عجب خان کے پاس بھیجنے والی تھی اور ہم عجب خان کو چمرکنڈ لے آتے اور فرنگی کو اتنی مہلت ہی نہ دیتے کہ وہ افغانستان پر بغاوت ٹھونسنے میں کامیاب ہو جاتے مگر حکومت افغانستان کو کچھ اپنی کوتاہیوں کی سزا دینا قدرت والے کو منظور تھی پھر اس میں انسان بے بس نہ ہو تو کیا ہو۔

باہم مشورے

مولانا فضل الٰہی صاحب چمرکنڈ کے امیر تھے بشیر صاحب نے گو ابھی تک بیعت نہیں کی تھی مگر جمعیت اور اسلام کی خدمت بغیر کسی رخنے کے سرانجام ہو رہی تھی۔ آج رات

دونوں صاحب مشورہ کے لیے اکٹھے ہوئے، افغانستان میں مولانا بشیر علی الحد تک واقفیت واثر رکھتے تھے۔ مولانا فضل الٰہی صاحب کی واقفیت زیادہ نہ تھی۔ اس لیے مولانا بشیر کے مشورے کو ترجیح حاصل تھی۔

سرداری کے مسئلہ پر اختلاف

دونوں اصحاب اس امر پر متفق تھے کہ ذوالقرنین بھائی اور راقم دونوں اس لشکر میں شامل ہوں مگر وہ اس پر متفق نہ ہو سکے کہ دونوں میں سے کس کو سردار بنایا جائے۔ مولانا فضل الٰہی صاحب کا موقف یہ تھا کہ ذوالقرنین صاحب سابق الہجرت ہیں اور عبدالکریم نیا ہے۔ اس لیے اہل لشکر جن میں عظیم اکثریت سابق مہاجرین کی ہے ان کو ایک نئے مہاجر کی اطاعت تکلیف لیطاق ہو گی اس لیے ذوالقرنین صاحب ہی سرداری کے منصب کے لیے مناسب ہیں۔ اس کے برخلاف مولانا بشیر صاحب کا موقف یہ تھا کہ ذوالقرنین بالکل ان پڑھ ہے اور ہماری جماعت پہلے ہی افغانستان کو یہ تاثر بہم پہنچا چکی ہے کہ جماعت میں کچھ علاقائی تعصب موجود ہے جس کے باعث سردار عموماً ہندوستانی ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ جاہل ہی ہوں۔ میں اس کاغذ پر دستخط ثبت کرنے سے قاصر ہوں جس سے مجھ پر یہ گمان صادق ہو سکے کہ میرے ہوتے وہ تعصب جماعت مجاہدین میں موجود ہے۔ دوسرا ان کا کہنا یہ بھی تھا کہ عبدالکریم اکثر افغانستان میں فرائض انجام دیتا رہتا ہے۔ لشکر میں کوئی بھائی عبدالکریم جتنی واقفیت اور قابلیت نہیں رکھتا اسی بنا پر اسے شامل لشکر کیا جا رہا ہے۔ میں کس طرح اپنے ضمیر پر پتھر رکھ کر آپ کی غلط خواہش پر حکم صادر کر دوں۔ غرض تمام رات اسی بحث میں گزر گئی۔ نہ تو ہم دونوں میں سے کسی کی شمولیت کی ضرورت کو نظر انداز کیا گیا اور نہ ہی یہ فیصلہ کیا جا سکا کہ سرداری کسے سونپی جائے۔ الغرض صبح ہر دو حضرات نے اپنی اپنی مہر اور دستخط سے الگ چٹھیاں لکھ کر ہمارے حوالہ کیں۔ دونوں چٹھیاں علی احمد جان رئیس تنظیم و سپہ سالاران افواج کے نام تھیں۔

مولانا فضل الہی کی تقریر

مولانا فضل الہی صاحب کی چٹھی پر لیں ابتداً تھی کہ ذوالقرنین صاحب اور دوسرے بھائیوں کو حکومت کی حمایت کے لیے بھیجا جا رہا ہے ان سے جہاں جو چاہے خدمت لیجیے چٹھیاں فارسی میں مرقوم تھیں مولانا بشیر صاحب کی چٹھی کا مضمون تقریباً یہی تھا۔ انھوں نے فقط ابتداً نام میں تغیر کیا تھا اور عبدالکریم (یعنی ناظم کا نام پہلے لکھا تھا) اگلی صبح نماز فجر کے بعد ہمارے ناموں کا اعلان کر دیا گیا اور ہم سب لوگ چند منٹ کے وقفے کے بعد اپنے اپنے اسلحے لے کر حاضر ہو گئے۔ مسجد کے صحن کے ساتھ گلی میں ہم سب کو اکٹھے ہونے کا حکم دیا گیا تھا جب ہم لوگ قطار بنا کر کھڑے ہو گئے تو مولانا فضل الہی صاحب نے مختصر تقریر فرمائی۔ آخر میں فرمایا کہ لشکر کا سردار ذوالقرنین بھائی ہو گا۔ مگر نماز عبدالکریم پڑھایا کرے گا۔ مولانا بشیر صاحب خاموش رہے اور کچھ معانقے مصافحے کے بعد جو لشکر میں حسب دستور تھا ہم لوگ روانہ ہو گئے۔

اطاعت سردار

اس سفر میں ہم لوگوں کو بجائے پیدل سفر کے دریائی جانے کے ذریعے سفر کرنے کا حکم ہوا تھا اس لیے ہم لوگ چند گھنٹے پیدل چل کر سرکانی پہنچے اور وہاں سے جالنے پر (جو مشکوں میں ہوا بھر کر ان کو رسیوں سے باندھ کر اوپر لکڑیاں باندھ لی جاتی ہیں) سوار ہو کر منزل مقصود (جلال آباد) کی جانب روانہ ہو گئے اور ایک رات راستے ہی گذار کر اگلے دن جلال آباد پہنچ گئے۔ میرے لیے حضرت مولانا بشیر صاحب کی مثال نمونہ تھی۔ جو باوجود سابقہ جمعیت پر قائم رہتے ہوئے، مولانا فضل الہی صاحب کی بیعت کے بغیر بھی دن رات اسلام اور جماعت کی خدمت میں مصروف تھے۔ میں تو بیعت سے وابستہ تھا۔ اس لیے عملاً حضرت امیر صاحب کے حکم کے مطابق نماز کی جماعت کراتا اور اپنے سردار کی اطاعت میں سرگرم رہتا۔

گورنر کا دفتر

جلال آباد جا کر معلوم ہوا کہ گورنر مسٹر عظیم ہاشمی ابھی محاذ پر ہیں اور ان کی نیابت میں گورنر جلال آباد نو وارد وں کے انتظامات پر مامور ہے۔ یہاں مجھے تعاون بطور خدمت اور اطاعت کرنا لازمی تھا میں یہاں کی ہر بات سے واقف تھا۔ اس لیے فرعا القرنین اور ایک بھائی حاجی شیر محمد صاحب جو تقریباً میرے ہم عمر تھے اور کچھ رعب دار شخصیت کے مالک تھے جب منشا ذوالقرنین گورنر کے دفتر گئے۔ اب تک میں نے علما مولانا البشیر کے نظریے کو قبول نہ کیا تھا۔ بلکہ میرا یہ ارادہ تھا کہ میں یہاں مولانا البشیر صاحب کی منتظمی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کروں اسی ارادے کو اپناتے ہوئے میں گورنر کے دفتر پہنچا۔

گورنر سے گفتگو

گورنر صاحب نے اپنا دفتر بجائے گورنمنٹ ہاؤس کے پانچ کرکب کی ایک عمارت میں لگا رکھا تھا۔ جب ہم دفتر کے قریب پہنچے تو گورنر کی نظر ہم لوگوں پر پڑی اور پیشتر اس کے کہ ہم اندر داخل ہونے کے لیے کوئی شناختی کارڈ اندر بھیجیں گر دفتر سے ایک معتبر ملازم برآمد ہوا۔ اور اس نے ہمیں کہا کہ گورنر صاحب آپ کو اندر بلاتے ہیں۔ ہم تینوں بظاہر پاکستان کے مہذب دیہاتی معلوم ہوتے تھے تینوں بندوقوں سے مسلح تھے۔ ہم گورنر صاحب کے پاس پہنچے تو انہوں نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم نشستوں پر بیٹھ گئے تو گورنر صاحب نے ہم سے سوال کیا کہ آپ کون لوگ ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ اور یہاں تمہارا کیا کام ہے ہمارے سرحادر ساتھ تھے۔ میں نے ان کی طرف دیکھا اور چاہا کہ وہ جواب دیں مگر وہ خاموش رہے اور بجلی کی تیزی کی طرح سے مجھ پر کتنے ہی خیال گذرے یہ سرحادر ہیں۔ میں نے ان کی امداد کا ارادہ تو کر رکھا ہے۔ مگر اگر یہ چپ رہتے ہیں تو کیا میں بھی چپ سادھے رکھوں اور معروف میں ان کی اطاعت کو ہی اپنا نصب العین تصور کیے رہوں اور جہاں وہ خود مدد کے طالب ہوں۔ دیانت داری سے ان کی امداد اور اطاعت کرتا رہوں۔ دوسری

طرف وہ چپ تھے اور مجھے ڈر ہو رہا تھا کہ ہماری خاموشی کچھ اور گل نہ کھلا دے ۔ تاناکچھ کر چکے
تک سردار چپ تھے ۔ یہ سوچ بچار لکھنے اور پڑھنے میں کافی وقت لگتا ہے مگر اس سوچ بچار
کی رفتار بہت تیز تھی اب مجھے بشیر صاحب کی احتیاط کو تسلیم کرنا پڑا اور میں نے ایک ہی سانس
میں اس کی سب باتوں کا جواب دیا جس طرح گورنر نے ایک ہی سانس میں تینوں سوال کر دیے
تھے ۔ میں نے کہا کہ ہم مجاہدین ہیں ۔ چمر کنڈ سے آئے ہیں اور حکومت کی حمایت کا جذبہ ہمیں
یہاں لایا ہے ۔

یہ گورنر نیا تھا نادر خان کے افغانستان سے چلے جانے کے بعد اب علی احمد خان
امان اللہ خان کے بہنوئی جو افغان انگریز جنگ سے پہلے افغانی وفد کے سربراہ ہو کر
ہندوستان آئے تھے اور اس دوران کسی رنجش کی بنا پر خانہ نشین کر دیے گئے تھے اب
رہا کر کے سمت شرقی کے رئیس تنظیم اور بغاوت کے فرد کرنے کی غرض سے سپہ سالار کے
منصب پر فائز کر دیے گئے تھے ۔

یہ گورنر صاحب علی احمد خان صاحب موصوف کے چچا تھے ۔ معمر تھے مگر افغان تھے
اور رعب داب کے مالک تھے میرا ان سے پہلے کوئی تعارف نہیں تھا ۔ میرے جواب کے
بعد گویا ہوئے ۔ عام لشکر جو یہاں مختلف اطراف سے وارد ہو رہے ہیں آپ ان سے
مختلف ہیں اور لوگ ہمارے لشکر سے کھانا کھاتے ہیں ۔ کیا آپ اس لشکر کے کھانے کو پسند
کریں گے یا آپ کے لیے کچھ رسد کا انتظام کیا جائے ۔

خوراک کا انتظام اور ماموریت

میں نے کہا پہلی بات یہ ہے کہ ہمارا آپ سے کوئی کام نہیں ہمارے پاس رئیس تنظیم کے
نام چٹھی ہے وہ یہاں نہیں ۔ اس نے کہا کہ میں ان کی طرف سے نو واردوں کا انتظام کرنے پر مامور
ہوں ہماری ماموری کی جگہ بتا دیجیے ہمارے پاس اپنے کھانے کا اپنا انتظام ہے ۔ آپ ہماری
خوراک کا فکر چھوڑ دیں ۔ گورنر بولا ۔ اچھا آپ کو نقد خرچہ دے دیا جائے ۔ کس قدر روزانہ
کافی ہو گا اور ساتھ ہی اپنے میر منشی کو حکم دیا کہ حاکم خزانہ کو لکھ دو کہ ان کے لیے روزانہ

فی نفر ایک قیران (النسف کابلی روپیہ) ادا کیا جائے۔

میں نے اس کو ٹوکا کہ آپ بے تعلق اور غیر ضروری امر کے پیچھے پڑ رہے ہیں حالانکہ ضرورت ہے کہ ہمیں یہ بتایا جائے کہ ہمیں کس جگہ اور کس حیثیت سے کیا کام کرنا ہے اور جس چیز کی ہمیں ضرورت نہیں آپ اس پر زور دے رہے ہیں۔ وہ بولا مرزا صاحب ایک قیران ان لوگوں کے لیے ٹھیک نہیں ایک روپیہ روزانہ فی نفر خوراک کے لیے حاکم خزانہ کو گورنر کی طرف سے لکھ دو اور خانساماں کو حکم دو کہ ان کو ضروری رہائشی سامان شطرنجی (فرشی ادنی دری) وغیرہ مہیا کرے اور شاہی گارڈ کے گھر ان کیلئے وقف کر دے۔

اب میں بھی سمجھ چکا تھا کہ گورنر کا اتنا ہی فرض تھا۔ ماموریت اس کے بس کا روگ نہیں تھا چنانچہ میں خاموش ہو گیا اور گورنر سے رخصت چاہی تا کہ جا کے رہائش اور سامان متعلقہ حاصل کر کے بھائی لوگ کو وہاں قیام کا انتظام کریں اور ماموریت کے لیے رئیس تنظیم کا انتظار کریں۔ حاکم خزانہ کے نام کا حکم نامہ میں نے اپنے قبضے میں لے لیا اور حکمنامہ پر گورنر نے میرا نام لکھ دیا۔ دوران گفتگو اس نے میرا نام پوچھ لیا تھا۔ اب اس مقام پر حکومت کے ساتھ سارا کام مجھ پر آن پڑا۔ جس پر ذوالقرنین بھائی نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور نماز اور اندرونی کاروبار حسب الحکم امیر جاری رہا۔

ہمارا تقرر

چند روز کے بعد رئیس تنظیم جلال آباد آئے۔ انہوں نے ہم تینوں سے ذوالقرنین بھائی کے منشاء کے مطابق ملاقات کی۔ پہلے میں نے خیال کیا کہ رئیس تنظیم کو ایک ہی سرکاری چٹھی دی جائے۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ رئیس تنظیم امیر جماعت کو بالکل نہیں جانتا۔ کیونکہ جب مولانا فضل الٰہی صاحب کابل گئے تھے ان دنوں وہ خانہ نشین تھے ان سے مولانا کی ملاقات ہی نہیں ہے اور وہ ابھی رہا ہو کر نکلے ہیں ان کو کیا معلوم جماعت کے نظم میں تبدیلی آ چکی ہے۔ اس لیے مجبوراً دونوں چٹھیاں ان کو پیش کی گئیں۔ وہ ایک زیرک افسر تھے۔ اس تضاد کو تاڑ گئے۔ انہیں یہ پوچھنے کی ضرورت پیش

زمی کہ ذوالقرنین صاحب کون ہیں اور عبدالکریم کون۔ کیونکہ چٹھیاں پیش کرتے وقت ذوالقرنین صاحب خاموش رہتے تھے اور میں نے ہی مولانا بشیر صاحب کا زبانی پیغام کہ وہ عنقریب آ رہے ہیں انہیں دیا تھا۔ وہ کچھ حیران ہوئے پھر یوں کہنے لگے۔ آپ کی آمد کی ہمیں سب سے زیادہ خوشی ہے مگر ہم آپ کو سب سے زیادہ اہم جگہ مامور کریں گے اور یہ جگہ جلال آباد ہے جہاں کی حفاظت آپ کے ذمے ہو گی اس لیے آپ کو کسی اور جگہ نہیں جانا ہے یہیں قیام فرمائیے یہی آپ کی ڈیوٹی ہے۔

میرا بیان

کچھ دنوں کے بعد مولانا بشیر صاحب تشریف لائے۔ میں نے ان کو من و عن حالات بتائے اور جس جس مقام پر میرا ارادہ ان کی احتیاط اور خیال کو نظر انداز کر دینے کا تھا۔ ان سے صاف صاف کہہ دیا اور اپنا موقف بتایا کہ میں نے جماعت کے وقار کو بچانے کے لیے ایسا سوچا تھا مگر اس مجبوری سے آپ کی احتیاط کو ماننا پڑا۔ وہ میری صاف بیانی پر بہت خوش ہوئے۔

جماعت کے اختلافات

اس موقع پر انہوں نے بڑے دکھ سے ایک بات مجھ سے کہی کہ ہماری تعداد بہت تھوڑی ہے۔ کچھ تو جماعت کے اختلاف کا اثر ہوا اور ہم جماعت کے دوسرے حصے کے مخلص افراد کے تعاون سے محروم ہو گئے وہ اسمست میں بیکار دن گذار رہے ہیں جب کہ ہمیں ان کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنی زندگی اس مقصد پر صرف کریں جس کے لیے انہوں نے خویش و اقارب اور وطن چھوڑا ہے۔ ان کے ساتھ ہونے سے ہماری نفری بھی زیادہ ہو جائے گی۔ ادھر امیر صاحب کی بے احتیاطی سے ہم کئی اہم شخصیتوں سے محروم ہو گئے ہیں اور وہ فرنگیوں کی قید میں پس رہے ہیں۔ کاش اسمست سے سلسلہ جنبانی کی کوئی صورت پیدا ہو۔ دو تین روز تک اسی موضوع پر گفتگو رہی کہ کس طرح ہماری نفری بڑھ سکے اور

ہم قابل قدر خدمات انجام دے سکیں ۔ مولانا دو تین دن قیام کر کے رئیس تنظیم سے بھی ملے جو مولانا کی آمد کی خبر بذریعہ فون ہونے پر ملاقات کی غرض سے آئے تھے ۔ ملاقات کرنے کے بعد رئیس تنظیم واپس چلے گئے ۔

چمرکنڈ کی جماعت

اس اثناء میں اسمست سے پالیس بھائی جلال آباد کی طرف آ رہے تھے ۔ میں نے ان کے استقبال کے لیے مولانا بشیر صاحب سے اجازت لی ۔ وہ میرے مربی تھے اور اکثر میرے وجدان پر کاربند ہونے پر نہ ٹوکتے تھے بلکہ حوصلہ افزائی فرماتے تھے ۔ مجھے تھوڑا تھوڑا بخار بھی اس وقت تھا تاہم گھوڑا تیار کر دیا اور میں نے ان کا استقبال کیا ۔ شہر سے باہر تو وہ لوگ بے ترتیبی سے چلتے رہے لیکن شہر کے قریب آ کر میں نے انہیں ترتیب سے قطاروں میں مارچ کر دیا ۔ راستہ شہر سے ہو کر گزرتا تھا ۔ جب ہم شہر میں داخل ہوئے تو چند فوجی افسر جو چھاؤنی کو جا رہے تھے سامنے سے گذرے ان کو ہمارے اسلامی طریقے سے فوجی سلامی دی گئی ۔ وہ لوگ بہت خوش ہوئے ۔ ایک جرنیل صاحب نے سرکاری اخبار میں مجاہدین کے آنے کا نقشہ یوں کھینچا کہ لشکر تو اور بھی بہت سے ملک میں وارد ہوئے ہیں ۔ لیکن جس شوق اور ولولے سے مجاہدین داخل ہوئے ہیں یہ ان کی ہی شان تھی ۔ ہم عصر کے بعد جلال آباد میں وارد ہوئے تھے ۔ مولانا نے بڑی خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا ۔ میں نے مولانا کی خدمت میں پلاؤ کی دیگ کی درخواست کی جو قبول ہوئی ۔ عشاء[۱] سے پہلے کھانے سے فارغ ہوئے اور پھر عشاء پڑھی گئی ۔

میری تقریر

نماز کے بعد میں نے درخواست کی کہ سب بھائی چند منٹ میری گذارش سنیں چنانچہ

---

[۱] ہمارے لشکر خصوصاً اسمست میں عشاء کافی دیر کر کے پڑھی جاتی تھی ۔

میں نے مختصر الفاظ میں جمعیت عالیہ کے مقاصد بیان کیے اور ان سے التجا کی کہ ہم عوام نے جس مقصد کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ کر جمعیت کے حوالے اپنے آپ کو کر رکھا ہے وہ مقصد ہم اب بعض شخصیتوں کی نذر کر چکے ہیں۔ اگر جماعت امیر رحمت اللہ صاحب مولانا فضل الٰہی صاحب یا البشیر صاحب کی ذات کا نام نہیں۔ اور نہ ہم نے ان شخصیتوں کی رضا کے لیے ہجرت اور جہاد کا بار اپنے ذمہ لیا ہے۔ اور اگر ٹھیک ہم نے سب کچھ خدا تعالےٰ کی رضا جوئی کے لیے کیا ہے تو ذرا سوچیں کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ اس وقت مولانا بشیر کے علاوہ ہم بھائی اسمس سے نو وارد تھے اور چمرکنڈ کے بھی چھبیس بھائی موجود تھے۔ اس مختصر تقریر کا ردعمل کچھ دیر بعد میرے سامنے آیا۔ فوری طور پر چمرکنڈ کے بعض اصحاب نے اس طریق گفتگو کو پسند نہ کیا مگر اسمست سے آنے والے اکثر بھائی بہت محظوظ اور مسرور ہوئے۔ اگرچہ بعض اہل غرض ان میں بھی اچھا اثر لینے والے نہ تھے مگر اس کا جواب دینے یا تردید کرنے کی ہمت کسی کو نہ ہوئی۔ اسمست والے اس رات اسی شاہی مسجد میں فروکش رہے اور چمرکنڈی اپنے کمروں میں چلے گئے۔

لشکر کی خدمت

راقم دونوں لشکروں کا خادم اور بے دام نوکر تھا۔ لشکر میں کوئی بھائی بیمار ہوا اس کی دوائی وغیرہ کے لیے شفاخانے یا طبیب سے دوائی کا انتظام اور تیمار داری میری ذمہ داری بن گئی۔ ایک دفعہ بنگال کے ایک بھائی کے دائیں کان کے نیچے ایک بہت بڑا پھوڑا نکل آیا۔ یہ پھوڑا تقریباً ڈھائی انچ پھیلاؤ میں اور تقریباً سوا یا ڈیڑھ انچ موٹائی میں تھا۔ اس پھوڑے کو دیکھ کر دوسرے لوگ دہشت زدہ ہو جاتے تھے تو جس کے ساتھ یہ بیت رہی تھی اس کا حال کیا ہو گا۔ اسے لے کر جب میں ہسپتال پہنچا تو پیچھے ان کے سردار منشی محمد حنیف صاحب اور تین دیگر بنگالی بھائی بھی پہنچ گئے۔ ہسپتال کے ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب نے جب مریض کا حال دیکھا تو از راہ ہمدردی دوسرے مریضوں سے اس کے اپریشن کو مقدم کر دیا۔ مریض نے اپنے بھائیوں اور سردار کی موجودگی کی پرواہ نہ کرتے

ہوئے میری ٹانگ کو اپنے دونوں بازوؤں میں لے کر ڈاکٹر کو اشارہ کیا کہ چلائیے نشتر۔ ڈاکٹر صاحب نے ٹرے میرے ہاتھ میں تھما دی اور اپریشن کر دیا۔ بلا مبالغہ دو ٹرے مواد سے بھر گئے۔ الحمدللہ مریض نے کسی خاص گھبراہٹ کا مظاہرہ نہ کیا۔ اور خدا کی مہربانی سے مریض چند دنوں میں صحت یاب ہو گیا۔ زخم بھر جانے کے بعد مریض لشکر میں چلا آیا۔ اس کے بعد اسمت۔ کے لوگوں میں مجھے ہر دلعزیزی حاصل ہو گئی۔ اور سب اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے میری خدمات حاصل کرنے لگے۔ دراصل مجھے خود خدمت گذاری میں ایک گونہ مسرت ہوتی۔ کہ میں ان مجاہدین کے کام آ رہا ہوں۔

اسمت سے طلبی:۔

پہلے دن جب میں ان کے استقبال کے لیے گیا تو اکثر بھائی کھچے کھچے سے ملتے تھے مگر اب ان کے دل دھل چکے تھے اور سب میل صاف ہو چکا تھا۔ کہ مرکز اسمت میں خبریں پہنچ گئیں کہ عبدالکریم ان کی خدمات کے لیے پہلے ہی سے پہنچا ہوا تھا۔ اس کے نتیجے میں امیر اسمت جناب مولانا رحمتہ اللہ صاحب کا گرامی نامہ میری طلب گاری کے لیے ملا۔ وہ میں نے مولانا بشیر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ مجھے یقین تھا۔ کہ تمہارا اخلاص رائیگاں نہیں جائے گا۔

جمعیتِ عالیہ کا وقار:۔

مولانا بشیر صاحب وقفوں کے بعد تشریف لایا کرتے تھے۔ میں اپنے کام میں بفضل خدا خوب مصروف تھا۔ اور یہ کام رواں دواں تھا۔ وہ اکثر خوش ہوتے اور ایک ادنیٰ شخص کو اپنی تربیت کی وجہ سے کامیاب دیکھتے۔ یہ صورت ان کی خوشی کے لیے فطری تھی۔ انہوں نے مجھے اپنے کردار سے متاثر کیا تھا۔ پھر خدمات کے لیے انتخاب فرمایا۔ میرے لیے بس اتنی مسرت کافی تھی۔ کہ جمعیت

عالیہ کا وقار بلند دیکھ رہا تھا جس کی وجہ سے جو بڑا افسر یا مقامی شخص مجاہدین سے ملتا نہایت خندہ پیشانی سے پیش آتا اور جماعت کو افغانستان کا دوست اور ہمدرد تصور کرتا۔

باب ہفتم

افغانستان میں بغاوت

اگرچہ یہ تمام تذکرہ مجاہدین کی سرگذشت پر مشتمل ہے مگر بغاوت کے مفصل ذکر کے بغیر یہ تذکرہ بھی مکمل نہیں ہوتا۔ بغاوت فرنگیوں کی سازش سے پیدا ہوئی تھی اور خفیہ طور پر فرنگی اس کو طول دینے کے لیے باغیوں کو اسلحہ اور روپیہ فراہم کر رہے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ وہ اسلحہ جو امان اللہ خان نے فرانس سے خریدا تھا خانہ جنگی کی نذر ہو جائے اور افغانستان نے جو آزادی فرنگی کو مجبور کر کے حاصل کر لی ہے وہ دجل و فریب کے ذریعے واپس لے لی جائے۔ اس غرض کے لیے فرنگی امان اللہ خان کو تخت و تاج سے محروم کرنے کے لیے پورا زور صرف کر رہے تھے۔ افغانستان میں شخصی حکومت تھی۔ امان اللہ خان اپنی شخصیت اور حکومت دونوں کو بچانا چاہتا تھا مگر وہ اپنی رعایا کو محبوب رکھتا تھا اور جبر و تشدد اور خونریزی کو پسند نہ کرتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ باغی قبیلہ ایک نہایت طاقت ور بازو تھا جس کو کمزور یا ختم کر کے اپنی طاقت کو کمزور نہیں کرنا چاہتا تھا۔

قبائل کی مدد

افغانستان کے باقی تمام قبائل بغاوت کو فرو کرنے کے لیے میدان میں آ چکے تھے اور یاغستان (آزاد علاقہ) کے تمام قبائل ذکر قبائل محسود وزیری آفریدی شنواری، مہمند، باجوڑی افغانستان کی امداد کے لیے اقدام کئے تھے مگر امان اللہ خان افواج کو حملہ تو در کنار دفاع کی اجازت دینے میں تامل تھے۔ حتیٰ کہ باغی فوج پر شبخون مار کر اسلحہ لے گئے مگر امان اللہ خان اپنے ارادے پر اڑا رہا اور ہوائی جہاز کے ذریعے مصالحت آمیز اشتہارات

پہنچایا کہ باغی اگرچہ چاروں طرف سے گھیرے ہی لیے گئے تھے۔ مگر وہ بڑی برفانی چوٹیوں پر پہنچ گئے۔ یہ دسمبر اور جنوری کی ناقابل برداشت سردی کا موسم تھا۔ برفباری کے موقع پر قبائل عام طور پر نیچے اتر آتے ہیں لیکن اس سال وہ مجبور تھے۔ دوسری طرف اس سال اس قدر برفباری ہوئی تھی کہ بڑے بوڑھوں نے بتایا کہ انھوں نے اس سے قبل اتنی سردی اور برفباری نہیں دیکھی۔ حتیٰ کہ جلال آباد جو درجہ حرارت کے اعتبار سے لاہور کے برابر رہتا ہے اس سال برفباری سے محروم نہ رہا۔ اس شدت کی سردی کی وجہ سے قبائل کے تقریباً پچاس ہزار افراد لقمہ اجل ہو گئے۔ خود جلال آباد میں کئی لوگ سردی کا شکار ہو گئے۔ اور ہمارے لشکر کے چار مجاہد جو اسمست سے تعلق تھے فوت ہو گئے۔ دوسری طرف لشکری امان اللہ خان کی باغیوں سے رحم دلی کی وجہ سے بددل ہو گئے۔ بغاوت نے اس وجہ سے بھی طول کھینچا کہ فرنگیوں نے باغیوں کو ثابت قدم رکھنے کے لیے بے دریغ روپیہ اسلحہ اور دیگر سامان مہیا کیا۔ بالآخر حالات سے تنگ آکر حکومت کو اپنا رویہ بدلنا پڑا اور مارچ ۱۹۲۵ء کے آخر پر بغاوت کا خاتمہ ہوا۔ بغاوت کے فرو ہونے میں طاقت سے زیادہ عام معافی کے اعلان کا دخل تھا۔

مولانا البشیرؒ کا وقار۔

رمضان شریف شروع ہو چکا تھا کئی سو باغی سردار گرفتار کر کے جلال آباد لائے گئے انہی دنوں نادر خان صاحب کے چھوٹے بھائی شاہ ولی خان جو فاتح فوج کے جرنیل تھے ہماری قیام گاہ پر مولانا البشیرؒ سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ اتفاق سے بادشاہ گل صاحب جو جناب حاجی ترنگ زئی صاحب کے بڑے صاحبزادے تھے اس وقت مولانا سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ حالات حاضرہ کے متعلق بات چیت ہونے لگی۔ تینوں حضرات کے علاوہ مجھے بھی اس میں شرکت کا موقع ملا۔ ہم اپنے قیام گاہ کے چھوٹے سے باغیچے کی ایک روش پر دیوار کے قریب کھڑے تھے۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ مولانا کا وقار افغان اکابرین میں بہت زیادہ ہے۔ شاہ ولی بلند مرتبت ہوتے ہوئے

باوجود مولانا کے حضور نہایت نیاز مندی کا ثبوت بہم پہنچا رہے تھے۔ صاحبزادہ صاحب بھی مولانا کی شخصیت سے مرعوب تھے۔ بات چیت جب طول کھینچتی نظر آئی اور میں نے رمضان کی وجہ سے تینوں اصحاب کی تھکان کو محسوس کیا تو بھائی لوگوں کو آواز دے کر ایک شطرنجی لانے کو کہا۔ شاہ ولی صاحب پینٹ اور ہیٹ میں ملبوس تھے یہ کہتے ہوئے جلدی سے زمین پر بیٹھ گئے کہ اس مقام پر ہمارا مقام زمین ہے۔ ہم مولانا کے حضور زمین پر بیٹھنے کو خوش قسمتی تصور کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی مولانا اور ساتھ زمین پر بیٹھ گئے اور تکلف کے بطور صاحبزادہ صاحب کو بھی بیٹھنا پڑا۔

اس بظاہر معمولی واقعہ سے مجھے انسانی شرف و قدر کے معیار کا پتہ چلا اور مولانا بشیرؒ کی غیر معمولی قدر و منزلت کا بھی اندازہ ہوا۔ اس سے اگلے دن امان اللہ خان بہ نفس نفیس افواج اور قبائل سے سلامی اور مبارکباد کے لیے ایک میدان میں آنے والا تھا۔ یہاں اسے تقریر بھی کرنا تھی۔ اس موقع پر تقریب کے لیے ہی یہ گفتگو ہو رہی تھی۔ گفتگو میں اہم تفاصیل طے ہو چکنے کے بعد وہ دونوں حضرات رخصت ہو گئے۔

مولانا بشیرؒ کی تقریر

اگلے دن پروگرام کے مطابق افواج اور قبائلی جوان صف بستہ ایک میدان میں اپنے اپنے مقام پر کھڑے تھے۔ رمضان کے ابتدائی ایام اور مارچ کا اختتام تھا۔ تقریباً گیارہ بجے پہلے فوج امان اللہ خان کے آگے سے سلامی دیتی ہوئی گذری پھر قبائل نے سلامی کی رسم ادا کی۔ ہم بھی قبائل کے بعد امان اللہ خان کے پاس سے گذرے۔ امان اللہ خان مولانا صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ جب سب لوگ گذر چکے تو اپنے اپنے مقررہ مقام پر ایستادہ ہو گئے۔ اب امان اللہ خان سب کے سامنے سے سلام کرتے ہوئے اور مبارکباد کہتے ہوئے آہستہ آہستہ پیادہ جا رہا تھا۔ ہمارا مقام اختتام پر تھا۔ جب وہ ہمارے سامنے پہنچا اور مولانا کو دیکھ کر عقیدت کا مظاہرہ کیا۔ مولانا نے ایک جامع تقریر کی اور اس میں بغاوت کا الزام فرنگی پر عائد کیا اور آئندہ کے لیے اس کی طرف

سے خاص طور پر محتاط رہنے کی تلقین کی۔ تقریر تقریباً پندرہ منٹ جاری رہی اور دعا پر ختم ہوئی۔ اس دوران امان اللہ خان کان لگائے انتہائی توجہ سے تقریر سنتا رہا۔ تقریر کے بعد بادشاہ سلام کہتے ہوئے رخصت ہوا۔ اس کے بعد تمام قبائل کے نمائندے وزراء اور بڑوں دربار میں جمع ہوئے۔

امان اللہ کی تقریر

دربار ہال بہت بڑا تھا یہ قالینوں اور دیگر فرنیچر سے مزین تھا۔ مشرقی سمت کی دیوار کے ساتھ سٹیج بنائی تھی جس پر امان اللہ خان کی نشست گاہ تھی۔ شمالی اور جنوبی دو رویہ قطاروں میں آگے پیچھے کرسیوں کی صفیں تھیں۔ کرسیوں کے درمیان راستہ چھوڑا گیا تھا جس پر قالین کا فرش تھا۔

امان اللہ خان کی نشست اس صورت میں تھی کہ اس کا منہ قبلہ رخ تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ وزراء اور افسران فوج اور بڑے سرکاری افسر بیٹھے تھے بائیں طرف نمائندگان قبائل اور امرائے شہر فروکش تھے۔ مولانا بشیر منشی محمد حنیف صاحب اور راقم کو دائیں بائیں لے کر بائیں بازو والی پہلی صف میں بیٹھے تھے۔ امان اللہ خان نے تقریر شروع کی اور مولانا کی اس تقریر کا خاکہ جو انہوں نے میدان میں کی تھی زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا۔ اس موقع پر امان اللہ خان نے فرنگی کو کچھ طعن بھی دیے تھے۔

فرنگی سازش

اس تقریر کے جواب میں فرنگی نے اپنے پریس میں کچھ اول فول بکا اور بغاوت کا الزام روس کے سر منڈھنے کی ناکام کوشش کی تاہم مولانا نے جو تقریر کی تھی وہ محض جذبات کا مظاہرہ نہ تھا۔ اس کے ٹھوس ثبوت ہمارے پاس موجود تھے۔ راقم کے پاس باغیوں کو سپلائی کیے جانے والے کارتوس اور فرنگی کے پولیٹکل محکمہ کے ایک مسلمان افسر کی شکایتی چٹھی موجود تھی جو اس نے اپنے کسی دوسرے ساتھی کو لکھی تھی۔ یہ دونوں

افسر مرزائی نہیں تھے۔ اس کی تفصیلات یہ ہیں کہ پولیٹیکل پولیس نے ایک مشتبہ سادھو نما شخص کو
شبہ کی بنا پر گرفتار کر لیا اور سادھو نے افسر کو اپنی رہائی کے لیے کچھ قیمت پیش کرنی چاہی۔ سادھو
جو درحقیقت خود فرنگی خفیہ محکمے کا ایک انتہائی اعلےٰ فرد تھا۔ اس افسر کو کم حیثیت جان کر اسے
اعتماد میں لے کر اپنے مشن پر جانے کی بجائے اسے کچھ دے دلا کر اپنے مشن پر جانے کا
تہیہ کر بیٹھا۔ افسر کچھ دیانت دار تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ کوئی بہت بڑا جاسوس ہے اور
اسے پکڑوا کر اپنی نوکری اور انعام پانے کا انتظام کیا جائے۔ سادھو اپنی غلطی پہ جما رہا اور
بجائے حقیقت حال واضح کرنے کے رشوت کی مقدار بڑھاتا گیا۔ جوں جوں رشوت بڑھتی
گئی افسر کو اپنے شبہ میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس نے کسی قیمت پر سادھو کو نہ چھوڑنے کا
تہیہ کر لیا اور انگریز پولیس کمشنر کے پاس لے جا کر پیش کر دیا۔ اس انگریز پولیس کمشنر نے
اس مسلمان افسر کو سخت جھاڑ پلائی۔ اور کہا کہ تم نے اسے روک کر جتنا نقصان کیا ہے تمہیں
اس کی سزا ملنی چاہیے۔ یہاں نیکی برباد اور گناہ لازم کی صورت حال ہو گئی۔ اس نے یہ تمام
واقعہ اپنے ایک اور ہمدرد مسلمان افسر کو لکھ کر بھیجا کہ اس کے ساتھ یہ تکلیف دہ واقعہ
پیش آیا۔ اب خدا کا کرنا یہ ہوا کہ یہ چٹھی کسی طرح ہمارے ایک ہمدرد کے ہاتھ لگ گئی
اور اس نے اس چٹھی کی اہمیت کے پیش نظر یہ ہمیں بھجوا دی۔

سازش کا ثبوت

جب یہ چٹھی راقم کے پاس پہنچی اور دوسری طرف فرنگی نے اپنے جرم کو روسیوں
کے سر منڈھنے کی کوشش کی تو میں نے باغیوں کو سپلائی کیے جانے والے کارتوس، یہ چٹھی
اپنے ایک مختصر رقعہ کے ساتھ وزیر خارجہ محمود طرزی کو بھجوا دیے۔ اس رقعہ میں میں نے
لکھا تھا کہ روس نے بھی کتنی دھاندلی کی کہ بغاوت اپنی سرحد کی بجائے فرنگی کی سرحد پر
کروائی اور سب تھ ہی کروڑوں روپے کا اسلحہ باغیوں کو مہیا کیا۔ یہی نہیں بلکہ زیر زمین
سرنگوں یا آسمان کے ذریعے یہ سب کچھ فرنگی لیکے ہیں مہیا کر دیا۔ درحاصل اب یہ کوئی
راز نہیں رہ گیا کہ بغاوت کا اصل سرغنہ فرنگی تھا۔ اگرچہ ظاہر یہی کیا گیا تھا کہ بغاوت

ملاکڈ (یعنی لولاد لنگڑا) نے کروائی تھی۔ لیکن جاننے والے جلتے تھے۔ مولانا نے ٹھوس مواد کی بنیاد پر فرنگی پر الزام لگایا تھا جس کو امان اللہ نے اپنی تقریر میں دہرایا اور فرنگی ہی کو مورد الزام ٹھہرایا۔

ہاڈا صاحب

جلال آباد میں ہمارے قیام کے آخری دنوں میں مولانا بشیرؒ بھی زیادہ تر وہیں ٹھہرتے تھے یہ دن جماعت کے لیے بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ یہ زمانہ ہی ایسا تھا مجھے کام کی زیادتی کی وجہ سے پھرنا پڑتا تھا اس لیے ایک گھوڑا میری سواری کے لیے دے دیا گیا تھا۔ مولانا بشیرؒ مجھے متعارف کرانے کے لیے اکثر اکابرین علاقہ سے ملاقات کے لیے جاتے تھے۔ ایک بار ہم نے حضرت صاحب چار باغ سے ملاقات کی۔ چار باغ جلال آباد سے چند میل کابل جانے والی شاہراہ کے قریب واقع تھا۔ ہم جن صاحب کی زیارت کے لیے گئے یہ ہاڈا صاحب کے ان چند جانشینوں میں سے تھے جو علاقے کے مختلف مقامات پر ہاڈا صاحب کے مشن کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس طرح ہاڈا صاحب کے جانشینوں کی وجہ سے کئی مستقل گدیاں بن چکی تھیں۔ یوں تمام علاقہ ہاڈا صاحب کے معتقدین کی وجہ سے متبرک خیال کیا جاتا تھا۔ اسی طرح ہم ایک بار استاد صاحب ہاڈا شریف کی زیارت کے لیے ہاڈا صاحب پہنچے۔ ان کو اسی لقب سے موسوم کیا جاتا تھا۔ یہ بڑے صاحب اثر مانے جاتے تھے۔ مجھے بعض لوگوں نے بتایا کہ ہم ایک وقت بھنگ چرس تمبا کو افیون سب نشوں کے عادی ہو چکے تھے۔ استاد صاحب نے ہمیں ایک ہی دفعہ فرمایا یہ اچھی بات نہیں ہے اسے چھوڑ دینا چاہیے۔ مسلمان کو یہ زیب نہیں۔ ان کے ایک ہی دفعہ فرمانے کا اتنا اثر ہوا کہ اس کے بعد ہم نے ان تمام چیزوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اور ایسا کرتے ہوئے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ حالانکہ ایک نشہ بھی چھوڑ دینا بہت مشکل کام ہے۔

سردار فیض جان

سردار فیض جان وزیر تعلیم محمود خان صاحب کے چچا زاد بھائی تھے تقریباً ایک ماہ سے جلال آباد میں وارد تھے۔ ان کی مولانا بشیر سے بہت بے تکلفی تھی۔ وہ دو بار ہمارے یہاں کھانے پر مدعو تھے اور ہماری سادہ غذا کو بڑی رغبت سے تناول فرماتے۔ ایک دفعہ انھوں نے ہماری دعوت کی اور گن کر چالیس کھانے ہمیں مجبور کر کے چکھائے۔ وہ اکثر میری سواری کا گھوڑا سیر کے لیے لے جاتے اور اس کی بڑی تعریف کرتے۔

روسیوں کی خط و کتابت

انہی دنوں ایک عجیب واقعہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ مولانا عبید اللہ صاحب مع اپنے عملے کے کابل سے نکالے جا چکے تھے اور اب ان کو کابل چھوڑے دو سال ہونے والے تھے۔ اب روسی ہم پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے کئی خط مولانا یعقوب صاحب کی وساطت سے آ رہے تھے اور ان کا ہر دوسرا خط پہلے سے زیادہ لجاجت اور خوشامد سے بھرا ہوتا۔ یہ تمام خط مولانا صاحب کے علم میں لائے جا چکے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ہم ایک دفعہ کابل میں جا کر ان سے ملیں۔ ان کی یہ خواہش ہماری فرنگ دشمنی کی وجہ سے تھی مگر ہم کسی قیمت پر کسی اور کے اشاروں پر چلنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ہمارے دین کی رہنمائی ہمارے لیے کافی تھی۔ اس لیے اس بات کی ضرورت نہ سمجھی گئی کہ ان چٹھیوں پر کوئی اقدام کیا جائے۔

روسی سفیر کی پیشکش

میں مولانا بشیر کے ہمراہ جلال آباد کے بازار میں پشاوری دروازے کی طرف سے کابلی دروازے کی سمت جا رہا تھا کہ کابلی دروازہ کی طرف سے ایک گورا داخل ہوا۔ مولانا نے اسے پہچان لیا اور مجھے فرمایا۔ وہ گورا جو سامنے آ رہا ہے اسے دیکھ رہے ہو

میں نے عرض کیا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا یہ روسی سفیر ہے جو ہمیں چٹھیاں لکھ کر اب ہم کو کسی طرح ملاقات کے لیے یہاں آگیا ہے۔ اب تم یہ دیکھنا کہ یہ ہمیں سلام کرے گا۔ مگر ہمارے سوا کوئی نہیں جان سکے گا کہ اس نے کسی کو سلام کیا ہے۔ جب ہمارے سامنے اس مقام پر پہنچا جہاں پہنچ کر ہم یا وہ ایک دوسرے کو سلام کہتے۔ اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور دوسرے لمحے اس کا دوسرا گھٹنا زمین پر تھا گویا وہ گرتے گرتے اپنے گھٹنے کے بل گرنے سے بچ گیا ہو۔ مولانا صاحب اس کو اور وہ مولانا کو پہچانتا تھا۔ مولانا نے نہایت خفیف خندہ کر کے منہ کو اس طرف پھیرا جس طرف پر وہ سامنے آکر پھسلا تھا۔ اور بغیر رکے ہم آگے بڑھ گئے اور وہ گویا سنبھل کر بدستور چلنے لگا۔ مولانا نے آگے بڑھ کر مجھے بتایا کہ یہ اس کا سلام تھا اور اشارہ تھا کہ اگر تم ہمارے ساتھ ملنا چاہو تو تمہاری سب شرائط منظور ہیں۔ جلال آباد کے قیام کے دوران مولانا نے اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی اور جب ہم لوگ یاغستان کی طرف چلے گئے تو اس کے بعد مولانا کابل گئے تھے۔ معلوم نہیں کہ وہ ملے یا نہیں۔

بیساکھی کا تہوار

رمضان شریف قریب الاختتام تھا کہ تیرہ اپریل بیساکھی کا تہوار آن پہنچا۔ کچھ فتح کی خوشی اور کچھ فرنگیوں کی مخالفت کرنے کے خیال سے اس بیساکھی کو خاص اہمیت دی گئی اس سے کچھ ہی دنوں پہلے جب امان اللہ خان جلال آباد تھے۔ مولانا کے اشارے پر سکھوں نے ایک درخواست امان اللہ خان کی خدمت میں پیش کی کہ سلطان پور (جو جلال آباد سے کابل جاتے ہوئے پہلا سرکاری پڑاؤ ہے) ہمارا متبرک مقام ہے ہمیں اجازت دی جائے کہ اپنے متبرک مقام پر ہم بیساکھی کے موقع پر گرنتھ صاحب کا پاٹھ کر سکیں۔ ادھر امان اللہ خان کو اس سلسلے میں مصلحت سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ امان اللہ خان نے سلطان پور میں جتنی سرکاری عمارتیں، سرائے، ڈاک بنگلہ، (شاہی محل) اور کافی جاگیر سکھوں کو فوری طور پر عطا فرما دی اور رئیس تنظیم کو فرمایا کہ سکھوں کے تیوہار کو سرکاری سرپرستی حاصل رہے گی۔

چونکہ منظوری فوری طور پر ہو گئی تھی اس لیے سکھوں نے بھاگ دوڑ کر کے تمام نغانستان سے تقریباً ایک لاکھ ہندو سکھوں کے مجمع کا انتظام کر لیا۔ ہندوستان سے بھی کچھ سکھ لیڈر جن میں ماسٹر کابل سنگھ اور تیجا سنگھ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، بلا لیے گئے۔

مولانا بشیر خود مقامی انتظامیہ اور حکومت کی رہنمائی کے لیے یہاں موجود رہے۔ پروگرام یہ تھا کہ جلال آباد سے گرنتھ صاحب کو سرکاری موٹر میں سوار کر کے سلطان پور لایا جائے۔ سرکاری طور پر شاہی باغ کے پھولوں سے موٹر کو سجایا جائے اور سرکاری بینڈ جلوس کے ساتھ بجاتا ہوا چلے۔ جلال آباد کے تمام قابل ذکر افسر رئیس تنظیم، گورنر جلال آباد اور فوج اور سول کے اعلیٰ حکام جلوس کی عزت افزائی کے لیے نکلیں۔ مولانا بذات خود سارے انتظامات دیکھ رہے تھے۔ راقم بھی مولانا کے ساتھ حاضر تھا۔ لاری کو سجاتے سجاتے کہ تے ساڑھے نو کا وقت ہو چکا تھا۔ اب بینڈ کا پتہ کیا تو معلوم ہوا کہ بینڈ والے روزے کے خیال سے صبح سویرے سلطان پور چلے گئے تھے ان کو یہ علم نہ تھا کہ بینڈ یہاں بجانا ہو گا بینڈ کا انچارج کوتوال تھا۔ مولانا نے اس سے رابطہ کیا اور فرمایا کہ ایک لاری سلطان پور جا کر بینڈ کو واپس لائے۔ لاری اسی وقت روانہ ہو گئی۔ میدانی راستہ تھا اس لیے لاری آدھ گھنٹہ میں بینڈ لے کر واپس آ گئی۔ اب جلوس روانہ ہوا۔ اور تمام لوگ پروگرام کے مطابق پیدل چل رہے تھے۔ امیر حبیب اللہ خان کے مقابل شاہی مسجد سے آگے نکل کر جلوس رکا۔ یہاں اکثر سکھ لیڈروں نے تقریریں کیں۔ انہی دنوں نابھ ریاست میں جتیو کے مقام پر سکھوں پر گرنتھ صاحب کے پاٹھ کے سلسلے میں گولی چل چکی تھی۔

مہذب اور غیر مہذب حکومتیں

سکھ لیڈروں نے کچھ اس طرح تقریر کی کہ دنیا میں کچھ حکومتیں اپنے آپ کو مہذب کہتی ہیں اور کچھ دوسری حکومتوں کو وحشی اور غیر مہذب ہونے کا طعنہ دیتی ہیں۔ اب صورت یہ ہے کہ فرنگی جو اپنے آپ کو مہذب دنیا کا امام کہلواتے ہیں ہم پر ظلم کی انتہا کر رہے ہیں۔ ہمارا اپنا ملک اور اپنا گردوارہ ہے جب ہم اس گردوارے میں گرنتھ صاحب کا

پاٹھ شروع کرتے ہیں تو وہ مہذب فرنگی ہم پہ گولی چلاتے ہیں۔

دوسری طرف افغانستان کا معاملہ دیکھیں جسے وحشی کہا جاتا ہے۔ ہمارا مذہبی تہوار منانے کے سلسلے میں ہماری اتنی امداد ہو رہی ہے۔ گرنتھ کا جلوس ہے موٹر حکومت کی سامان آرائش اور بینڈ حکومت کا اور سرکاری طور پر گورنمنٹ خود سرپرستی کر رہی ہے۔ گویا سکھوں کا نہیں حکومت کا تہوار ہے۔ نہ صرف جلوس بلکہ تمام اخراجات اور انتظامات حکومت کے ہیں۔ ان تقریروں کے بعد رئیس تنظیم نے مختصر تقریر کی اور پھر واپس چلے گئے گورنر اور باقی افسر کچھ دور اور جا کر واپس ہوئے اور جلوس تیرہ میل دور بینڈ بجاتا ہوا پہنچا۔

اگلے روز رئیس تنظیم نے ایک نشست کی صدارت کی اور سلطان پور کی تمام سرکاری عمارتیں سکھوں کو بخش دی گئیں۔ میلے میں شریک لوگوں اور جلسے کے لیے تمام خیمہ گاہیں حکومت کی استعمال ہوتی رہیں۔ ایک نشست کی صدارت مولانا بشیر نے بھی کی۔

ہندو سکھ گٹھ جوڑ

فرنگیوں نے دوسری طرف کیا چال چلی کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر اس احسان ناشناس بے فیض قوم کو مسلمانوں کے خلاف یہاں تک استعمال کیا کہ ۱۹۲۵ء کے بعد فسادات کا نقشہ ہی بدل گیا۔ پہلے جو فسادات فرنگی اور ہندوؤں کی سازش سے ہوا کرتے تھے اور ہندو مسلم فسادات کہلاتے تھے اب مسلم سکھ فسادات کا روپ دھار گئے۔ اس کے بعد ہر جگہ سکھ فسادات میں پیش پیش نظر آتے تھے۔ ہم نے افغانستان میں سکھوں سے اتحاد کی بنیاد اس نظریہ پر رکھی تھی کہ مسلمان اور سکھ دونوں مارشل قومیں ہیں یہ متحد ہو جائیں تو ملک جلد آزاد ہو جائے گا۔ دوسری طرف ہندو بنیا انگریز کے سہارے ترقی پا کر اپنے ملک کو ذاتی مفادات پر قربان کر دیتا ہے۔ تاہم ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

فرنگی اور ہندوؤں نے ہر موقع پر مسلمانوں کو ان کی نیک تمناؤں اور آرزوؤں

کی سزا دینے کے لیے سکھوں کو آگے کیا اور مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔

بھائیوں کی وفات

اس سے پہلے میں اسمت کے چار بھائیوں کی وفات کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس کی تفصیل یہاں بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ غازی عبدالرشید صاحب کے ہندوستان چلے جانے کے بعد صوبیدار یوسف خان سے کافی اچھی ملاقات رہا کرتی تھی۔ وہ جلال آباد میں مقیم تھے ۱۹۲۵ء میں جب میں اپنی بیوی کو لینے کے لیے چمرکنڈ سے لوٹ کر سرکانی پہنچا تو مولانا بشیر صاحب کی ایک چٹھی مجھے ملی اس میں صوبیدار صاحب موصوف کی وفات کی افسوسناک خبر کے علاوہ اسمت کے دو بھائیوں کی خطرناک بیماری کی اطلاع بھی دی تھی۔ میں نے ایک جالا کرایہ پر لے کر جلد جلال آباد پہنچنے کا ارادہ کیا۔ تاہم سردیوں میں دریا میں پانی کم ہونے کی وجہ سے رفتار سست تھی۔ عام طور پر سرکانی سے چلنے کے دوسرے دن ظہر و عصر کے درمیان جالا جلال آباد جا لگتا ہے لیکن مجھے پہنچنے میں تین دن لگ گئے۔ یہاں مجھے جان کر سخت تشویش ہوئی کہ بھائی شہادت اللہ صاحب جو مولانا عبدالکریم صاحب قنوجی سابق امیر چمرکنڈ کے داماد بھی تھے سخت علیل ہیں اور ان کے بچنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تھی۔ میں جناب بہادر علی صاحب مہاجر کے مکان کی نچلی منزل میں اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر ان کی تیمارداری میں جا لگا۔ وہ تقریباً آدھی رات کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہو کر پہنچے تو دیکھا کہ بھائی عبدالکریم یوپی والے شدید بیمار تھے۔ اگلی رات وہ بھی اللہ تعالیٰ کو جا ملے۔ سردی نہایت جوبن پر تھی۔ کئی دن متواتر سفر اور مصروفیت کے باعث بخار اور نزلے نے مجھ پر بھی حملہ کر دیا مگر فرائض منصبی نے مجھے چارپائی پر نہ پڑنے دیا۔ ادھر عبدالکریم صاحب کے بعد بنگال کے ایک بھائی بیمار پڑ گئے۔ ان کی تیمارداری اور دوائی کے انتظام کے لیے بھاگ دوڑ کی وجہ سے تکلیف میں کچھ اضافہ ہو گیا۔

مرض کا شدید حملہ

مولانا نے اب مجھے روکنا چاہا کہ میں آرام کروں لیکن میں نے سنی ان سنی کر دی اور مسلسل خدمت میں مشغول رہا۔ دو دن کے بعد بنگال کے بیمار بھائی وفات پا گئے ان کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے تھے کہ بنگال ہی کے ایک اور بھائی بیمار پڑ گئے۔ اس سے اگلے دن وہ بھی وفات پا گئے۔ ان کو جب دفن کرنے جا رہے تھے تو مولانا نے مجھے دیکھ کر فرمایا۔ کیا ارادہ ہے تم اس حال کو پہنچ گئے مگر آرام نہیں کرتے۔ میں نے عرض کیا کہ آرام کی باری آ پہنچی ہے۔ اگلے دن مجھے مجبوراً ایک مریض کی حیثیت سے بستر مرض کے حوالے ہونا پڑا۔ اس کے بعد پورا ایک مہینہ اس کمرے کی دہلیز تک جانا نصیب نہ ہو سکا۔ حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ لیٹے لیٹے نماز شروع کر دیتا لیکن بے سدھ ہو کر بھول جاتا۔ پھر پڑھنے کی کوشش میں دو چار کلمے ادا کرنے کے بعد بیہوش ہو جاتا۔ موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ بیوی ان دنوں امید سے تھی اور ایک بچہ دو سال کا تھا۔ میرا علاج ایک ہندو عطار کر رہا تھا جو طبیب بن چکا تھا۔ پشاور کا بنا ہوا شربت بنفشہ اور شربت نیلوفر ہی میری دوا کے طور پر دونوں وقت دیے جا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھیے مجھے کچھ اور دن زندہ رہنا تھا کہ میں ایک مہینہ کے بعد کمرے کی دہلیز تک پہنچنے کے قابل ہوا۔ جناب مولانا بشیر رحمۃ اللہ علیہ صاحب اکثر میری عیادت فرماتے۔

بیوی کی واپسی

میں ابھی اچھی طرح چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوا تھا کہ میر بیدار صاحب کی بیوی کو وطن پہنچا دینے کا فیصلہ ہوا۔ یہ بیوی کا اپنا ارادہ تھا۔ میری بیوی نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں بھی ان کے ساتھ ہی واپس چلی جاؤں گی۔ چنانچہ وہ بھی ساتھ ہونے کی وجہ سے ان کے ہمراہ روانہ ہو گئی۔ اب تک میری طبیعت بھی کافی بہتر ہو چکی تھی۔ اس مقام پر مختصر حال اس نومسلمہ کے استقلال اور صبر و استقامت کا بیان کرتا ہوں۔ میرا خیال ہی نہیں

یقین ہے کہ میں جن حالات میں سے گذرا ہوں اور جن مصائب سے دوچار رہا ہوں کوئی دوسری عورت خصوصاً مسلمان معاشرے سے تعلق رکھنے والی عورت میرے ساتھ اس طرح نہ نبھا سکتی تھی۔ مختصر واقعات کا ذکر میری اس رائے کی تائید کرے گا۔

بیوی کی عزیمت

جب میں نے ہجرت کا ارادہ کیا تو میں نے اس سے کہا کہ میں ہجرت کا مصمم ارادہ کر چکا ہوں تم اپنے لیے فیصلہ کی مختار ہے۔ اس نے کہا میں ساتھ جانے کو ہمہ تن تیار ہوں۔ میں نے کہا کہ ہجرت کوئی معمولی بات نہیں اپنی زندگی کو دکھوں اور مصیبتوں میں دھکیلنے کے مترادف ہے اور تم ایک عورت ذات ہو مصیبتوں سے گھبرا کر اس وقت میرا ساتھ چھوڑنے سے پہلے یہاں سوچ سمجھ لو اور یہیں رہ جاؤ۔

ہجرت کے ارادے کے بعد میں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور تیاری شروع کر دی۔ ہم امرتسر آ گئے جہاں میری بڑی بھانجی سل کے مرض میں مبتلا پڑی تھی۔ اس لڑکی سے اس کا مثالی پیار تھا۔ اتفاق سے اسے بھی تپ دق کا موذی مرض لاحق ہو گیا۔ اب دونوں کا علاج شروع ہو گیا۔ میرے بہنوئی بھی ہجرت کا ارادہ کر چکے تھے بلکہ وہی شام چوراسی (جہاں میں ملازم تھا) جا کر مجھے رغبت دلانے کا باعث ہوئے تھے۔ اب بیماری تھی کہ پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھی۔ بقول کسے

ملک الموت کی ضد ہے کہ میں جاں لے کے ٹلوں
اور مسیحا کی یہ خواہش کہ مری بات رہے

اسی کشمکش کے دوران جناب مولانا احمد علی صاحب کے قافلے کی رخصتی کی تاریخ آ گئی۔ چنانچہ میں نے ارادہ کر لیا کہ اسی قافلے میں شرکت کی جائے۔ بھائی صاحب تو لڑکی کی بیماری کی وجہ سے رک گئے۔ میں نے پھر ایک بار اس کو چھوڑ کر اکیلا جانے کا ارادہ ظاہر کیا کہ تم رک جاؤ۔ مگر اس نے کہا کہ جو بھی ہو اب تو ساتھ ہی رہیں گے۔ اب میری والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ عنقریب یہ مر جائے گی۔ فارغ ہو کر چلے جانا۔ میں نے عرض کیا

اب مجھے نہ روکیے۔ اگر یہ رکتی ہے تو اسے رکھ لیجیے۔ مگر یہ نہ مانی۔ لاچار میں نے والدہ کی خدمت میں عرض کیا کہ اب ہمیں بخوشی اجازت دے دیجیے۔ رہی اس کی مخدوش حالت تو جہاں تک یہ جیے گی لیے چلوں گا۔ جہاں مر کر ساتھ چھوڑ دے گی وہیں اسے دفن کر کے اپنی منزل لوں گا۔ غرض اسی حالتِ نیم مردگی میں اس نے ساتھ نہ چھوڑا اور بقول ؎

ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

میرے ساتھ ہولی۔ راستے کا کچھ حصہ یہ صاحب فراش رہی اور پھر راستے ہی میں خدا تعالے کی کرم نوازی سے اس کی بیماری جاتی رہی۔ اور کابل داخل ہونے سے پہلے یہ غسل صحت سے فیض یاب ہو چکی تھی۔ جب کہ انہی دنوں اس کی دوسری محبوب سہیلی یعنی میری بھانجی اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔

بیوی کی خدمت گذاری

جمرکنڈ میں لشکر کی زندگی کوئی پھولوں کی سیج نہ تھی۔ لیکن ناز و نعم میں پلی ہونے کے باوجود اس خدا کی بندی نے انتہائی صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا۔ احمت کے حملوں کے درمیان رات رات بھر بیدار رہ کر ہر طرح کی تکلیف مردانہ وار برداشت کی اور حرف شکایت زبان پر نہیں لایا۔ بھائیوں کے کپڑے سی کر دیتی رہی۔ اور اسے خدمت دینی سمجھتی رہی۔ لشکر میں چھوٹے بچے جو گر پڑ جاتے ان کے ہاتھ پیر گرم پانی سے دھو کر انہیں کریم لگا دیتی جو اس نے اب تک احتیاطاً محفوظ رکھی ہوئی تھی۔ ایک چھوٹا سا دل بچہ جس کا نام خبیب بھائی تھا (جس کا باپ لشکر میں سید بابا کے نام سے مشہور تھا۔) اس کے سر میں گنج تھا اور وہ ہر وقت ٹوپی رکھتا جس کی وجہ سے اس کے سر میں سڑاندسی محسوس ہوتی۔ اس نے اس کا ٹوپی کھول کر دھویا اور سر کو صابن سے دھو کر اس میں تیل لگایا۔ اسے ٹوپی کے رکھنے سے روک دیا اور سر کچھ دنوں کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔ کچھ ہی دنوں میں اس کے بال بھی آگئے لگے اور صفائی کی وجہ سے بچہ خوبصورت نظر آنے لگا۔

میں نے اپنے بھائی صاحب کو امرتسر لکھ کر بچے کے لیے گرم سویٹر بھجوا دیا تھا۔

میری بیوی جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے نانتہ غم کی پردہ دار تھی لیکن لشکر میں آنے کے بعد اس نے نہ صرف اپنا شاندار لباس ترک کر دیا بلکہ اعلیٰ بستروں کے ساتھ ساتھ ملبوسات بھی بیت المال میں داخل کروا دیے۔

جلال آباد روانگی

دسمبر ۱۹۲۲ء کے آخر میں مجھے جلال آباد جانے کا حکم ملا۔ وہاں سمت مشرقی کے نئے گورنر عبدالکریم جو قاضی القضاۃ کے صاحبزادے بھی تھے تعینات ہوئے تھے۔ مجھے ان کی تقرری پر مبارکباد دینے، جماعت کے تعارف اور جماعت مجاہدین اور حکومت افغانستان کے تعلقات کے اظہار کے لیے وہاں جانا پڑا۔ وہاں پر میری ملاقات غلام محمد صاحب عزیز لیڈر ہجرت (المعروف عزیز ہندی) سے بھی ہوئی۔

شدید سردی

اک بار بھائی عبدالقدیر کو جو کتابت سیکھنے کی غرض سے غازی عبدالرشید صاحب کے پاس موجود تھے، چمرکنڈ واپس لانا تھا۔ میں نے بیوی کے لیے بادام خریدے تھے کچھ اور سامان بھی مل ملا کر تیرہ چودہ سیر ہو گیا تھا۔ اتفاق سے رحمت اللہ نامی ایک مقامی جس کی منزل چمرکنڈ سے تین چار گھنٹے آگے تھی اور وہ ایک گدھے پر کچھ بوجھ لے کر جلال آباد آیا ہوا تھا اور خالی ہاتھ واپس جا رہا تھا۔ نہایت قلیل معاوضے پر میرا سامان لادنے پر رضامند ہو گیا تھا۔ اب ہم تین ہم سفر ہو گئے تھے۔ جلال آباد سے چل کر ہماری تیسری رات سرکانی میں آئی اور گدھے کی وجہ سے ہم نے دریا سرکانی کے مقام پر پار کرنے کا فیصلہ کیا۔ یوں تو پہلے دو دن بھی ہمیں سردی کا شکار ہونا پڑا تھا مگر تیسرے دن خاص طور سے موسم کی خرابی سے دوچار ہوئے۔ دریا کے دائیں کنارے جدھر ہوا کا رخ سامنے سے ہوتا ہے اور سارا دن ہلکی بارش اور سامنے سے ٹھنڈی اور تند در دار برفانی ہوا کے تھپیڑے لگ رہے تھے۔ ہمارے ہاتھ ہو کر بالکل بیکار تھے۔ سرکانی کے دریا پار کا سردیوں میں جالا

رسے کے بل پر کھینچا جاتا ہے۔ ہم جب سرکانی کے سامنے پہنچے شام ہونے کو تھی اور جالا پار جانے کے لیے تیار تھا۔ ہم لوگ مع گدھے کے جالے پر سوار ہو گئے۔ رواج کے مطابق رسے کو باری باری کھینچ کر جالا پار لگایا جاتا ہے۔ جب ہماری باری آئی تو ہمارے ہاتھوں سے کام نہ کیا گیا۔ ازراہ ہمدردی ہم کو چھوڑ کر باقی لوگوں نے جالے کو پار لگایا۔ شام کا وقت ہو رہا تھا اس لیے سب لوگ جالے سے اتر کر سامنے مسجد میں جا گھسے۔ تاکہ نماز سے پہلے کچھ گرم ہو لیں۔ مگر ہم تینوں ابھی جالے پر تھے۔ میرا سامان ہم تینوں کے ہاتھ شل ہونے کی وجہ سے اٹھایا نہ جا رہا تھا۔ ہم تینوں باری باری زور لگا چکے تھے۔ ہم اسی کوشش میں تھے کہ سرکانی چھاؤنی کا ایک حوالدار ہمیں ڈانٹنے لگا کہ تم جالا خالی کر دو۔ تاکہ دوسری طرف اور لوگ آنے والے ہیں۔ میں نے اس کو کہا کہ تم عجیب آدمی ہو دیکھ کر کہ ہم کوشش کر رہے ہیں ہماری مدد کرنے کی بجائے ہمیں دھونس دے رہے ہو۔ سامان جوں توں کر کے اٹھایا گدھے والا تو گدھے کو لے کر جائے پناہ کی تلاش میں چلا گیا اور ہم دونوں مسجد میں داخل ہو گئے آگ کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ حرکت میں آئے اور سامان اٹھا کر ایک کونے میں رکھ دیا دو آدمیوں نے ہمارے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ملنا شروع کیا۔ ہمارے ہاتھ بالکل شل ہو چکے تھے۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ان میں کچھ جان آئی۔ اس کے بعد نمازِ مغرب ادا کی گئی۔

حوالدار کی بدتمیزی

ابھی ہم نماز سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ ایک سپاہی مسجد میں داخل ہوا اور مجھے کہا کہ تمہیں چھاؤنی بلایا جا رہا ہے۔ میں عبد القدیر کے ہمراہ چھاؤنی میں جو مسجد سے ڈیڑھ سو قدم کے فاصلے پر ہوگی۔ داخل ہوا۔ دروازے کے قریب ہی وہ حوالدار صاحب ایستادہ تھے۔ خشمگیں نگاہوں سے ہمیں گھورا اور ایک سپاہی کو کہا "اینان را نگاہ دار یعنی کہ ان لوگوں کا خیال رکھنا"۔ میں نے اسے کہا کیا ہمیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ وہ بولا بیشک۔ وہ یہ کہہ کر جا رہا تھا کہ میں نے اس سے کہا۔ کیا ہمیں جانتے ہو۔ اس نے کہا۔ ضرورت نہیں

میں نے کہا ”امان اللہ خان کو جانتے ہو ہم اس کے دوستوں میں سے ہیں۔ اس نے کہا پرواہ نہیں
اب امان اللہ بھی آکر رہائی نہیں دے سکتا۔ میں نے کہا چند منٹ بعد تم کو مجھ سے آکر معافی مانگنا
ہوگی پھر بس تمہاری یہ اکڑ تمہیں یاد دلاؤں گا۔ وہ اپنی اکڑ میں چلا گیا۔ ہم سردی کھاتے ہوئے
تھے ہمارے اعصاب شل ہو رہے تھے۔ ایک برآمدے میں سے قدرت کے کرشمے کا
انتظار کرنے لگے۔ چند منٹ بعد ہمیں ایک سپاہی نے کرنل صاحب کا پیغام دیا کہ کرنل
صاحب اپنے دفتر میں یاد کرتے ہیں۔ میں نے کہا ان سے کہو کہ ہم یہاں گرفتار ہو چکے ہیں
اس لیے ہمیں حاضری سے معاف رکھا جائے۔ وہ کرنل صاحب کے پاس گیا اور واپس آکر
کہنے لگا کہ آپ آئیں تو سہی تاکہ معاملہ پتہ چلے۔ میں نے کہلا بھیجا کہ ہم گرفتار ہیں اور اب ہمیں
امان اللہ خان بھی آکر آزاد کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ وہ واپس آیا اور اس نے دوبارہ
منت سماجت کی اور کہا کہ کرنل صاحب بہت پریشان ہیں آپ خود انہیں آکر تمام بات سے
مطلع کریں۔ میرا مقصد بھی یہی تھا کہ کرنل صاحب کے پاس پہنچنے سے پہلے انہیں اپنے
ماتحت کی بدتمیزی کا پتہ چل جائے۔ ادھر ہمارے ساتھ یہ سلسلہ چل رہا تھا۔ ادھر کرنل
صاحب کو معلوم ہو گیا کہ دو مجاہدین (عام لوگ ایک مجاہد کو بھی مجاہدین کہتے تھے) کو فلاں
حوالدار نے یوں کہا ہے۔ ہمارے پہنچنے سے پیشتر وہ حوالدار کرنل صاحب کے سامنے
پیش ہو چکا تھا۔ کرنل صاحب مجھے پہچانتے تھے۔ اس واقعہ سے چند دن پہلے اس علاقے
کے کمانڈر بریگیڈیر محمد صدیق خان جلال آباد کماندار اعلیٰ کے عہدے پر فائز ہوئے تھے
انہوں نے اس موقع پر مولانا بشیر صاحب اور امیر صاحب کو مدعو کیا تھا۔ ان کے ہمراہ
راقم اور ذوالقرنین بھی تھے۔ بریگیڈیر صاحب جس طرح ہماری مدارات کر رہے تھے
یہ کرنل اس کا چشم دید گواہ تھا۔ کرنل صاحب مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر بغل گیر ہوئے
اور اصرار کیا کہ آج ہماری مہمانی قبول کیجیے۔ میں نے معذرت کر کے اجازت چاہی
اور ہم رہا ہو کر مسجد پہنچے۔ عشاء ادا کی اور صبح چمرکنڈ روانہ ہو گئے۔

سنجڑی روانگی :۔

چمرکنڈ پہنچنے کے چند روز بعد ہی مجھے جماعت کی طرف سے دیے گئے ایک کام کے سلسلے میں سنجڑی جانا پڑا۔ یہاں پر حکیم عبدالجلیل صاحب کا جو چارسدے میں کانگریس کے صدر تھے، پیغام ملا کہ یہ جگہ فرنگی کے جاسوسوں کا گڑھ ہے۔ یہاں کسی پر اعتماد نہ کرنا۔ خود باباصاحب بہت سیدھے ہیں اور فرنگی جاسوسوں نے انہیں کھلونا بنا رکھا ہے۔ فرنگیوں کا عام وطیرہ تھا کہ وہ سرحد کے ان سادہ بزرگوں کو تصوف کے ذریعے سے اپنی راہ پر لے آتے۔ اس کے لیے پڑھے ہوئے جاسوسوں کو روحانی پیاس بجھانے کے بہانے ان کے پاس بھجوا آتا۔ تاکہ وہ شیطان کا رول ادا کرتے ہوئے سب سے پہلے اس بزرگ کو کہے کہ میں نے بڑے بڑے مشہور بزرگوں سے فیض حاصل کرنے کی کوشش کی مگر جو فیض مجھے باباصاحب (آپ) سے ملا کہیں نہ پایا۔ اس لیے کہ اس وقت روحانی بادشاہت آپ ہی کی ہے۔ اس سلسلے میں بعض دوسرے بزرگوں کو یہ کہہ کر کوستا کہ فلاں بزرگ اپنے آپ میں بڑے صاحب کرامات ہیں مگر میں تو ان کو آپ کے مقابلے میں ہیچ سمجھتا ہوں جب کہ وہ آپ جیسے بلند مرتبت بزرگ کے آگے اپنے آپ کو بھی کوئی چیز سمجھتا ہے اور یہی کھیل ہر بزرگ سے کھیلا جاتا۔ یہاں بھی میں نے دیکھا کہ جمعہ کے خطبہ میں پشتو کے اشعار میں بابا سنجڑی کی مبالغہ آمیز تعریف کے ساتھ ساتھ ہاڈا صاحب کو ہاڈا سنگھ کا خطاب دیا جاتا مگر یہ بزرگ اپنی تعریف کے مقابلے میں اس گالی کو پی جاتے اور شاعر یا خطیب کا مقصد ہاڈا صاحب کو گالی دے کر فرنگی کو خوش کرنا ہوتا۔ کیونکہ ہاڈا صاحب فرنگی کے دشمن اور اس کے مقابلے میں ڈٹ کر جہاد کا فریضہ ادا کرتے تھے اور غیور قبائل کو جہاد کی فضیلت بتا کر فرنگی کے مقابل لا کھڑا کرتے تھے۔ ان بزرگ کے سامنے اس مجاہد کی جو اس دنیا سے اپنے اسلام کو سلامت لے جا چکا تھا توہین کی جاتی مگر وہ اپنی تعریف سن کر اتنا بے سدھ ہو جاتا کہ اس کو یہ بھی یاد نہ رہتا کہ ان کی اپنی عزت بھی فرنگی دشمن کہلانے کے صدقے میں تھی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ عوام میں وقار کو بحال رکھنے کیلئے

ہر دوسرے چوتھے فرنگی دشمنی کا مظاہرہ بھی کرتے۔

چاند ماری

ہمارے سترہ دن کے قیام کے دوران چونکہ بابا صاحب کو ہماری جانب سے مبالغہ آمیز تعریف کی وہ غذا جو ان کی زندگی کا حاصل بن چکی تھی نہ مل سکی اس لیے ان دنوں بابا صاحب کی طبیعت خراب رہی۔ ایک دن جب کہ ہمیں تقریباً وہاں پندرہ دن گذر چکے تھے، اچانک شور ہوا کہ بابا صاحب ٹِز کرنے (فائر کرنے) کے لیے برآمد ہو رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد بابا صاحب اپنے چند حواریوں خوشامدیوں کے جھنڈ میں گھرے ہوئے نکلے۔ ہمیں بھی مہمان ہونے کی حیثیت سے اس جلوس کے ساتھ شامل کیا گیا۔ بابا صاحب ایک مقام پر جو ان کی چاند ماری کے لیے مقرر تھا، تشریف فرما ہوئے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ واقعہ اس صورت میں کیوں پیش آیا یہ اللہ تعالٰے ہی بہتر جانتے ہیں۔ مگر ہوا ایسا ہی جیسا میں بیان کر رہا ہوں۔ ایک بندوق بابا صاحب کی خدمت میں پیش کی گئی اور بابا صاحب نے ایک جھاڑی (جو سامنے پہاڑی پر تقریباً چھ سو گز کے فاصلے پر ہو گی) کی طرف اشارہ فرمایا اور گویا ہوئے۔ یہ ایک پلید فرنگی ہے میں اسے واصل جہنم کرتا ہوں۔ ان کے خوشامدی ڈنر سے پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ بابا صاحب کا نشانہ کبھی خطا نہیں کیا مگر نشانہ ایک طرف گز بھر ہٹ کر لگا۔ دھول نے ظاہر کیا ایک ہلچل سی مچی کہ یہ کیا ہوا۔ دوسرا فائر ہوا تو جھاڑی کے دوسری طرف پڑا۔ دھول نے نشاندہی کی۔ دوسرے فائر پر زیادہ حیرانی کا اظہار ہوا اور بابا صاحب نے تیسرا فائر داغ دیا جو جھاڑی سے عین گز بھر نیچے پڑا۔ بابا صاحب کی طبیعت ناساز ہے۔ خوشامدیوں نے فوراً کہا۔ میں بھی قریب تھا۔ ایک حواری نے مجھے ٹھونکا دیا۔ آپ بابا صاحب سے بندوق مانگیں وہ ایسا کرنے پر خوش ہوتے ہیں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ہم لوگ خود کوئی بوجھ نہیں اٹھاتے تاہم اگر حکم ہو تو تعمیل کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک کڑیل افغان جوان کو یہ فخر حاصل ہوا۔ بندوق اس نے مانگ لی اور فائر کیا۔ خدا ہی

بہتر جانے کہ کیا بات تھی کہ اس کا فائر بھی خطا گیا۔ ایک اور نوجوان نے اس کی تتبع میں بندوق لی اس کا فائر نشانے کے قریب پڑا۔ مگر بالکل صحیح نہ بیٹھا

مجاہدین کا نشانہ

اب باباصاحب نے بندوق تھام کر میری طرف بڑھا دی۔ اب میرے لیے عذر کا سوال ہی نہ تھا۔ مگر مجھ سے پہلے فائروں کا انجام میرے سامنے تھا۔ میں نے بندوق تھامی اور اپنے پروردگار کی جناب میں جو کل مخلوق کا مالک ہے یوں سوالی ہوا۔ خدایا میں تیرا ایک حقیر اور ناچیز بندہ ہوں مگر میری ناکامی سے میرا تو کچھ نہ بگڑے گا کیونکہ میں تو ہوں ہی ہیچ۔ مگر میرا تعلق تیرے ان مخلص بندوں سے ہے جنھوں نے اپنی زندگیاں تیری رضا پر قربان کر رکھی ہیں۔ میری ناکامی سے یہ نتیجہ ہو گا کہ سمجھا جائے گا کہ مجاہدین میں کوئی نشانچی موجود نہیں۔ اس الحاح وزاری کے ساتھ نشانہ لیا اور دبا دی۔ معًا باباصاحب کا ہاتھ میرے کاندھے پر تھا وہ مجھے مبارکباد دے رہے تھے کہ نشانہ بالکل درست رہا۔ اس کے بعد باباصاحب نے بندوق مجھ سے لے کر میرے ساتھی بچے صدیق کی طرف بڑھائی۔ میری زبان پر پھر وہی الفاظ جاری ہو گئے جو پہلے درج کر چکا ہوں۔ اور دوسرے لمحے باباجی کا دست مبارک صدیق کے کندھے پر تھا اور لوگ کہہ رہے تھے کہ بچے نے دشمن کی ٹانگ زخمی کر کے گرا لیا ہے۔ اب بھاگ کر نہیں جا سکتا۔ الحمد للہ اللہ تعالٰے نے ہمیں اتنے عظیم نشانچیوں میں ممتاز کرنے کے لیے یہ موقع پیدا کیا تم الحمد للہ یہ واقعہ یکم فروری ۱۹۲۳ء کو پیش آیا۔

ہمارا سفر

۳ر فروری ۱۹۲۳ء کو عصر سے ذرا پہلے باباصاحب سے اجازت لے کر ہم واپس روانہ ہو گئے۔ باباصاحب اگرچہ آزاد علاقہ کے بالکل آخری سرے پر تھے لیکن ہمیں واپسی کی جلدی تھی ہم شام تک دریائے دیر کے کنارے سیلی پٹی ایک بلند پہاڑی پر

مقیم ہوئے۔ یہ جگہ نہایت سرد تھی تیز ہوا چل رہی تھی۔ ہم نے جوں توں کر کے رات کاٹی۔
اور علی الصبح نماز فجر کے بعد روانہ ہو گئے۔ دریائے دیر پار کرنے کی جگہ چند میل پر تھی۔ یہاں
دریا پار کرنے کے لیے پل نہیں بلکہ دریا کے دونوں کناروں پر بلند چوٹیوں کی چٹانوں
میں کھونٹے گاڑ کر ایک مضبوط رسہ باندھ رکھا ہے اور اس کے ساتھ ایک پیڑھی لٹکی
رہتی ہے جس پر ایک وقت میں ایک شخص بیٹھ کر پار اترتا ہے۔ پیڑھی کے ساتھ ایک مضبوط
رسی دونوں کناروں پر اس طریقے سے بندھی ہوتی ہے کہ اگر پار جانے والا ایک کنارے
پر اور پیڑھی دوسرے کنارے پر ہو تو رسی کے ذریعے کھینچ کر اس طرف لایا جا سکے جس
طرف مسافر ہو۔ ہم نے ایک دوسرے کے بعد دریا پار کیا۔ دریا کا پانی اس مقام پر بہت
نیچے ہے۔ یہاں دیودار کے درخت بھی بہت ہیں اور چٹائیاں بنانے والے پٹھے کا
یہاں بھاری جنگل ہے۔ عصر کا وقت گزر رہا تھا جب ہمیں ایک بستی ملی۔ یہاں ہم نے
وضو کیا اور میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ اگر ہم رات اس بستی میں رہ جائیں تو بہتر ہے۔ صبح
سے ہمیں کھانا نہیں ملا۔ یہاں کھانا بھی مل جائے گا۔ اور مہمان بن جانے کی وجہ سے ہم
شر سے بھی محفوظ رہیں گے۔ اس علاقے کے لوگ بہت اجڈ اور جاہل ہیں اور راہگیروں
سے چھینا جھپٹی ان کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ مگر ان کی بستی میں رات بسر کرنے والا پشتو کے
رواج کے مطابق مہمان شمار ہوتا ہے اور مہمان کو وہ لوٹ نہیں سکتے۔ ہمارے آگے
بہت اونچا پہاڑ تھا۔ بادل گھر آئے تھے اور لونڈا باندی کا اندیشہ تھا۔ میرا ساتھی اس
راستے پر کئی بار آ چکا تھا اور اس حیثیت سے میرا رہنما بھی تھا۔ اس نے کہا کہ ہم سر پہاڑ
کی جڑ میں پڑھیں گے اور رات پہاڑ کے پار ایک بستی ساڑا مینا میں بسر کریں گے۔
بہر حال وضو کر کے ہم پہاڑ کی چڑھائی کے قریب ایک بڑے پتھر پر جو سر راہ تھا نماز
ادا کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ دوگانہ ہی تو ادا کرنا تھا۔ مگر ہم ابھی دوسری رکعت
میں کھڑے تھے کہ بستی کی جانب سے بہت سے پیروں کے بھاگنے کی آواز آئی۔ چپلیوں
میں لوہے کے موٹے کیل لگے ہونے کی وجہ سے آواز بہت کرخت تھی۔ اور یہ ہمارے
قریب آ کر رک گئی۔ ان میں سے ایک آواز نے یہ انکشاف کیا کہ ہم دراصل ہندو ہیں اور

نماز کا بہانہ اس لیے بنایا ہے کہ یہ لوگ کہیں لوٹ نہ لیں۔ اس نے دلیل یہ دی کہ اگر مسلمان ہوں تو چپلیوں سمیت نماز نہ پڑھیں۔ حالانکہ ہماری چپلیاں پاس پڑی تھیں۔ دراصل ہماری جرابوں پر چمڑے کے موزے تھے جس کی وجہ سے سفر میں تین دن تک پاؤں دھوئے بغیر مسح جائز ہے۔ انہوں نے غلطی سے یہ سمجھا کہ ہم جوتیوں سمیت نماز پڑھ رہے ہیں۔ نماز ختم کر کے جب ہم نے سلام پھیرا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ اب ہمارے چہرے ان کے سامنے تھے ابھی ہم دعا میں مصروف تھے کہ ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور اس نے سب کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ آج رات ہماری بستی میں قیام کریں اور ہمیں میزبانی کا موقع دیں۔ آپ کے سامنے بہت بلند پہاڑ ہے۔ ادھر بادل گھر آئے ہیں۔ بارش شروع ہونے والی ہے۔ پہاڑ پر چڑھتے چڑھتے اندھیرا بڑھ جائے گا اور ممکن ہے کہ چوٹی تک جاتے جاتے برفباری شروع ہو جائے گی۔ بقول شاعر اس نے ہمیں کہا ہے

ع بدگمانی نہ کرو آج رہو گھر میرے!!
شب اندھیری بھی ہے بادل بھی ہے گھر دور بھی ہے

خطرناک سفر

اس کی پیشکش قابل قدر تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ برف شروع ہوتے ہی عموماً درندے بھی نکل آتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کوئی درندہ گزند پہنچائے۔ اس کی پیشکش کے باوجود میں اپنے ساتھی کے فیصلے سے متفق تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد سمجھانے کے لہجے میں کہا کہ بھائی یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ موت کا ایک وقت معین ہے وہ اپنے وقت سے پہلے نہیں آسکتی اور وقت آنے پر اسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔ تمہیں درندے کا جو خوف ہے اس کے تعلق میرا خیال ہے کہ موت یا بیمار ہو کر آتی ہے یا کسی حادثے کے نتیجے میں اور عام طور پر بیمار آدمی چارپائی پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتا ہے سو یہ بتاؤ کہ اس میں مزا ہے یا اچانک حادثے میں لقمۂ اجل ہو کر فارغ ہونا زیادہ بہتر ہے۔

پھر درندے کا کیا کہنا۔ قبروں میں پتہ نہیں کتنی دیر میں زمین یا کیڑے کھا کر ختم کریں۔ درندے کے کھا جانے کی صورت میں اس کی بیٹ ہوا اور ہماری خلاصی ہوئی۔ یہ سن کر وہ بے ساختہ ہنس دیا اور کہنے لگا جائیے آپ کو کوئی چیز گزند نہیں پہنچا سکتی۔

راہزن سے سابقہ

اب ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ پہاڑ پر چڑھائی کے دوران کافی اندھیرا چھا گیا البتہ چوٹی پر جا کر پہلے سے پڑی برف کی ہلکی روشنی تھی۔ عین چوٹی پر ایک افغان جوان نمودار ہوا۔ اس کے پاس موٹے کارتوس والی بندوق تھی اور گردن کارتوسوں سے بھری تھی۔ ہمارے پاس کیا تھا بھیگے ہوئے تھیلوں سے کمبل اور بس۔ پٹھانوں کا طریقہ واردات عموماً یہ ہوتا ہے کہ اول وہ سوال کرتے ہیں تم کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو۔ کہاں جاتا ہے پھر سوالوں کے جواب میں اگر مسئول نے ان کی حرص کو ہوا دینے والے جواب دیے یعنی ڈرا ہوا بولا تو ایک کمزور پٹھان اپنے سے طاقتور پر غالب رہتا ہے۔ دوسری صورت میں اگر جواب کرارے ہوں تو طاقتور پٹھان بھی ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ حسب معمول اس نے سوالات کا آغاز کیا۔ ہم ان کی تکنیک سے باخبر تھے۔ اس وقت ہماری حالت پنجابی مثل کی سی تھی کہ جیہڑے لاٹھی وو جتنے ہیں تے اللہ کلے۔ مگر موقع کو دیکھتے ہوئے اس کے جوابات اس طرح دیے۔

س کہاں سے آئے ہو۔

ج سنجڑی بابا سے۔

س کہاں جاتا ہے۔

ج چمرکنڈ۔

س کون ہوتے ہو۔ ہم کو نہیں جانتا۔ (ذرا ترش لہجے میں)

ج پھر پوچھتا کیوں ہے۔ (ذرا اور ترشی لہجے میں)

اس پر اس نے نرمی سے کہا ایسے ہی۔

میں نے ذرا ترش اور تیز لہجے میں کہا چل چلتا ہو اور وہ چلتا بنا۔

چچازادوں کی جنگ

پہاڑ کے نیچے اترتے وقت کافی وقت ہو گیا تھا۔ اب برف نہیں تھی۔ مگر ہلکی بوندا باندی جاری تھی۔ پہاڑ کی جڑ میں پہنچ کر ایک مکان سر راہ سے نظر آیا۔ مجھے سخت پیاس لگی تھی۔ خدا کی شان کہ صبح سے بغیر آب و دانہ سفر اور ایسے میں شدید پیاس کی حالت میں میں نے صاحب خانہ کو آواز دی۔ پانی ہے۔ اندر سے نوجوان اور کرخت آواز گونجی۔ کون ہو کمبخت فرنگی کے جاسوس ہر وقت گھومتے رہتے ہیں۔ میں نے کہا قوم پر در صاحب پانی رہنے دو ہم آپ کے گھر کا پانی نہیں پئیں گے۔ جو پشتو کے رواج سے بھی باخبر نہیں اور آگے چل دیے۔ اندھیرا غالب ہو رہا تھا۔ اور راہنما راستہ بھول چکا تھا۔ ہم جا رہے تھے کہ ایک آواز آئی کون ہے۔ جواب میں کہا گیا مہمان۔ اس نے جواب دیا جہاں کھڑے ہو وہاں سے بیس قدم پر مسجد ہے اس میں چلے جاؤ۔ ہم نے کہا روٹی لاؤ گے۔ اس نے کہا کہ ایک مہینے سے ہمارے چچازادوں سے ہماری جنگ ہے۔ وہ بھی اس وقت مورچے لیے بیٹھے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ آپ کی آواز پر کسی غلط فہمی میں حملہ نہ کر دیں۔ اس لیے اگر ہمارا آدمی کھانا لے کر باہر آتا ہے تو اسے خطرہ ہے۔ اس لیے اگر آپ ہمیں مجبور کریں گے تو ہم کھانا پہنچا دیں گے۔ آپ ہمیں اجازت دیں کہ ہم کھانا نہ لائیں۔ میں نے پوچھا کہ مسجد میں پانی ہو گا۔ وہ بولا کہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم ایک ماہ سے باہر نہیں نکل سکے ہم مسجد میں چلے گئے اور تیمم کر کے مغرب اور عشاء کی نماز ادا کی۔ باقی رات جوں توں کر کے گذاری۔ صبح نماز فجر بھی تیمم سے پڑھی۔ مسجد سے باہر نکلے تو راستہ بھول گئے اور جس لبستی میں رات گذارنے کا پروگرام تھا وہ بھی قریب تھی۔

ایک اور خطرہ

سالا مینا خار کی علداری میں واقع ہے ابھی ہم گاؤں سے باہر ہی تھے کہ ہمیں

گاؤں کے باہر حجرہ دکھائی دیا۔ مگر اس کے باہر دو نوجوان ایک سفید کپڑوں میں اور ایک سیاہ کپڑوں میں جو نواب خار کے ملازموں کا لباس تھا۔ دور سے ہماری طرف دیکھتے پائے گئے۔ ان کا رخ کچھ شرارت کی طرف مائل تھا۔ چنانچہ جب ہم نزدیک پہنچے تو انھوں نے ہماری طرف اشارہ کر کے کچھ عجیب حرکت کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد سفید لباس والا تو وہاں سے کھسک گیا اور وہ ملازم ہماری طرف تحکمانہ انداز میں بڑھ کر بولا تم کون ہو۔ میں نے کہا بھائی ہم فرنگی کے جاسوس ہیں جیسا کہ تم سمجھ رہے ہو۔ اس لیے یہاں آگئے ہیں کہ تم ہمیں پکڑ کر نواب کو پیش کر کے کچھ انعام حاصل کر سکو۔ وہ بولا۔ حجرے میں چلو۔ ان کی آپس میں اشارہ بازی سے مجھے شبہ گزرا تھا۔ اب یقین ہو گیا۔ حجرے میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ رات کی بارش سے پہلے ہی سردی میں اضافہ ہونے کی وجہ سے لوگ بھی گھروں میں آگ تاپ رہے تھے۔ ایسے وقت میں ہماری آمد سے ان دونوں نے فائدہ اٹھانا چاہا اور آپس میں ایک پروگرام طے کیا۔ اس کا پہلا حصہ سپاہی نے اپنے ذمہ لیا۔ اور آگے بڑھ کر ہمیں حکم دیا کہ حجرے میں چلو اور اگر ہم اس کا کہا مان لیتے تو اس کا مطلب ہوتا کہ ہم نے اس کا پہلا حکم مان کر اس کی برتری تسلیم کر لی ہے۔ اس کا دوسرا حکم لازمی یہ ہوتا کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ میرے حوالے کر دو۔ کیونکہ پشتو میں یوں ہی چلتا ہے۔ اس لیے ہم نے اس کا پہلا حکم ٹھکرا دیا اور آگے بڑھ کر اس کو پکڑ کر کہا کہ ہم حجرے میں نہیں چلتے ہمیں نواب کے پاس لے چلو۔ ورنہ ہم تمہیں پکڑ کر نواب کے پاس لے چلتے ہیں تاکہ نواب صاحب کو معلوم ہو کہ ان کا ملازم نمک حلال نہیں ہے اور اس کو دو تین دھکے دے کر اپنے آگے لگا لیا۔ اتنے میں بستی کے ایک معتبر بزرگ جو ہمیں پہچانتے تھے سامنے سے آگئے اور پوچھا کہ کیا بات ہے۔ میں نے کہا کہ اسی سے پوچھیے جس نے ہمیں شکار سمجھ کر ہمیں حجرے میں چلنے کا حکم دیا۔ انھوں نے سپاہی کو ڈانٹ پلائی کہ تم اندھے ہو کر اپنے لالچ کا شکار ہو رہے ہو اور مجھے فرمایا کہ دفع کرو اس خبیث کو اور چلیے کچھ چائے ناشتہ کر لیں۔

دوسرا رہزن

ہم نے کل سارا دن بغیر کچھ کھائے پیے سفر کیا تھا اور رات بھی اسی طرح گذاری تھی، مگر ابھی ہمیں سپاہی کے دوسرے ساتھی سے نمٹنا تھا جو اپنے پروگرام کے مطابق ہمارے راستے میں جا چھپا تھا کہ اگر ہم سپاہی سے بچ نکلیں تو وہ ہمیں لوٹ کر اپنی تمنا پوری کرے۔ ہم نے کہا کہ ہمیں جلدی ہے اور اس بزرگ کو سلام کر کے آگے چل دیے۔ بستی سے نکل کر ہم تھوڑی دور پہنچے ہوں گے کہ سپاہی کا دوسرا ساتھی ہمارے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اور تحکم سے بولا تم کون ہو۔ میں نے کہا تم ہمیں جانتے ہو تو پھر پوچھنے کا کیا فائدہ۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میری جیب کو ٹٹولا۔ میری جیب میں دو کلدار پیسے تھے جو باہر سے ٹٹولنے سے دو کابل روپے بھی سمجھے جا سکتے تھے ابھی وہ جیب سے ٹٹول رہا تھا کہ میں نے اس کی جیب میں اپنا ہاتھ ڈال دیا۔ اس نے میری جیب چھوڑ کر میرے کمبل کو ہاتھ ڈالا گویا کہ وہ کمبل کی کوالٹی پرکھ رہا ہو۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی جیب سے کھینچا اور اس کے اوپر کی گاڑھے کی سفید چادر کھینچ کر اتار لی۔ اب وہ ہمیں سمجھ چکا تھا۔ بولا معلوم ہوتا ہے تم ہمارے بھائی ہی ہو۔ میں نے کہا یہ تو تمہیں اس وقت سوچنا چاہیے تھا جب تم نے ہمیں شکار سمجھ کر لوٹنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کی چادر اس کو لوٹا دی اور آگے روانہ ہو گئے۔

بیٹے کی پیدائش

اب ہم نے مختصر راستہ اختیار کیا اور تین بجے تک راستے میں ہمیں کوئی بستی نہ ملی اور نہ کچھ کھانے پینے کو مل سکا اس وقت ہم سیدا شاہ بستی میں رسالدار رکن دین صاحب کے ہاں پہنچے۔ رسالدار صاحب نے ہماری بہت خاطر تواضع کی۔ مرغی ذبح کی اور چائے پلائی رات بھر ہم بخار میں مبتلا رہے۔ صبح ناشتہ کر کے ہم چمرکنڈ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اور دو ڈھائی بجے چمرکنڈ پہنچے۔ میں چھ فروری ۱۹۲۳ء کو چمرکنڈ لوٹا تھا۔ تین روز بعد ۹ فروری ۱۹۲۳ء کو مطابق ۲۳ جمادی الثانی ۱۳۴۱ھ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میرا

بڑا بیٹا حافظ فضل کریم پیدا ہوا۔

فسادیوں کی سرکوبی

بغاوت کے خاتمہ کے بعد حکومت کے وقار کی بحالی کے لیے بعض ان عناصر کی گوشمالی کی باری آگئی جو حکومت کو بغاوت فرو کرنے میں مصروف پاکر انفرادی طور پر اپنی سرکشی اور فسادی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے رہے تھے۔ چنانچہ ان میں جلال آباد کے اضلاع کے ایک ڈاکو کو سزائے موت دے کر عبرت کے لیے کابلی دروازے میں لٹکا رکھا تھا۔

دو بھائیوں کو جو سمت مشرقی صوبے سے تعلق رکھتے تھے۔ سزائے موت کا حکم ہو چکا تھا۔ رمضان المبارک کا تیسرا عشرہ تھا کہ انہیں جلال آباد لایا گیا۔ دونوں کا جلوس طوق وسلاسل سے آراستہ شہر سے گذارا جا رہا تھا۔ یہ نظارہ راقم نے خود دیکھا۔ یہ دونوں جکڑے ہوئے ہونے کے باوجود بڑے غرور اور تمکنت کا مظاہرہ کر رہے تھے شہر کے چوک میں آکر جلوس رک گیا۔

تقریباً ساڑھے گیارہ بجے کا عمل تھا جب جلوس رکا۔ بازار کی چھت کے ساتھ ایک چرخی میں (جو اسی غرض سے چوک میں لگائی ہوتی تھی) ایک طرف سے مضبوط رسہ ڈال کر مجرم کے گلے میں پھندا دیا اور دوسری طرف سے کھینچا۔ جب اس کے پاؤں زمین سے تقریباً چار فٹ اوپر اٹھ گئے تو رسہ کھینچنے والوں کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ اور مجرم پیروں کے بل زمین پر آ رہا۔ اس دوران گھبراہٹ میں رسہ سپاہیوں کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور مجرم کراہتے ہوئے زمین پر گرا تھا۔ جلدی جلدی اس کو کھڑا کیا گیا۔ اور دوبارہ رسہ کھینچ کر اس کو زمین سے تقریباً آٹھ فٹ اونچے پاؤں رکھ کر رسہ دوسری طرف لکڑی سے باندھ دیا گیا۔ لٹکنے کے ساتھ قیدی نے ایک جھرجھری سی لی اور ختم ہو گیا۔ اور پاؤں کی انگلیوں سے چند قطرے خون نکل کر وہیں جم گیا۔ عجیب عبرت انگیز منظر تھا چوک میں پہنچ کر جسے سولی دینا تھا اس سے پوچھا گیا کہ تمہاری کوئی خواہش ہے۔ اس نے پانی مانگا اور مختصر تقریر میں کہا۔ میں اپنی جان کی کافی قیمت وصول کر

چکا ہوں۔ ان کے مقابلے میں میری اور میرے بھائی کی جان کی کیا قیمت ہے۔ پاس فالودے کی دکان سے شربت کا گلاس لے کر اسے پیش کیا گیا۔ اس نے آدھا گلاس پی کر آدھا اپنے بھائی کو دیا۔ اور بولا جلدی کرو۔ اس کے لٹکانے میں اتفاقیہ دیر ہو گئی تھی اور دوسرے قیدی کو پورے بارہ بجے کے لیے توپ دم ہونے کے موقع پر توپ پر پہنچانا تھا۔ اس لیے جلوس جلدی جلدی توپ کی طرف روانہ ہو گیا جو شہر سے باہر ایک مقام پر رکھی تھی۔ پورے بارہ بجے دوسرے کو توپ کے آگے رکھ کر توپ فائر کر دی گئی۔ قیدی کے پرخچے اڑ گئے۔ پہلے چوک پر لٹکائی ہوئی لاش تین دن لٹکتی رہی اور اس میں تعفن پیدا ہو گیا۔ دکانداروں اور راہگیروں کی درخواست پر لاش اتار کر دفنا دی گئی۔

لشکر کی رخصتی

بغاوت فرد ہو چکی تھی، رمضان شریف کا آخری عشرہ آدھا گذر چکا تھا۔ امدادی لشکر واپس ہو رہے تھے۔ ہمارے لشکر کا داخلہ اگر شاندار تھا تو رخصتی بھی ایک تقریب کی شکل میں شاندار رہی۔ اسی موقع پر رئیس تنظیم سردار علی احمد جان نے ایک تقریر کی۔ انہوں نے کہا کہ قبائل کی امداد ضرور بڑی اہم تھی۔ لیکن آپ کی آمد ایک اور اعتبار سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے اور وہ یہ کہ آپ کا ایک ایک نفر ہمارے لیے ایک ایک قبیلے کا نمائندہ تھا ہندوستان کے مختلف علاقوں اور مختلف خاندانوں اور برادریوں سے تعلق رکھنے والے افراد کا یہ گروہ جو خالصتاً للہ ہماری مدد کے لیے آیا اور جس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے ہماری امداد کے لیے جاں سپاری کی پیش کش کی وہ ہمیشہ کے لیے یادگار رہے گی۔ انہوں نے ہر بھائی کے لیے ایک تمغہ شجاعت اور تیس روپے زادراہ کے لیے پیش کیے اور مولانا بشیر صاحب کے لیے ایک تمغہ غیرت (جو جرنیلوں کے لیے ہوتا تھا) ایک پستول، پچاس کارتوس، اونٹ کے پشم کا ایک سوکا (اوور کوٹ جو ٹخنوں تک لمبا ہوتا ہے) دو لنگیاں جو پگڑی کے اوپر بندھوائی گئیں، پانچ سو روپیہ نقد اور ایک فرمان جو شاہ افغانستان کے دستخط سے مزین تھا پیش کیے گئے۔ منشی محمد حنیف صاحب کو جو

اسمٰت کی طرف سے سرحدار تھے اور راقم کو مولانا بشیر صاحب ہی کی طرح پستول، کارتوس، تمغہ غیرت، شوکا اور لنگیاں اور تین سو روپیہ نقد دیا گیا۔ راقم نے روپیہ لنگیاں اور شوکا اسی وقت بیت المال مجرکنڈ میں دے دیا اور تمغہ فرمان شاہی اور پستول اپنے پاس رکھ لیا۔ مولانا تو اپنے پاس کچھ رکھتے ہی نہ تھے۔ راقم نے دو ہزار سے کچھ زائد روپیہ جو خرچ خوراک میں سے بچا ہوا تھا سکھیا سنگھ رام سنگھ فرم سے (جو ہماری جماعت کے خزانچی کی حیثیت رکھتے تھے) لا کر پیش کر دیا اس فرم کے ذریعے راقم نے ہندوستان سے ہر قسم کا مال منگوانے کا انتظام کر رکھا تھا چنانچہ جس قسم کا مال قبل پشاور میں ضبط ہو چکا تھا اسی ذریعے سے منگوا لیا تھا۔ خرچ خوراک خزانہ سے حاصل کر کے انہی کے پاس جمع کر دیا جاتا تھا۔

باب ہشتم
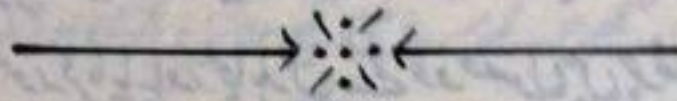
ایک اہم مشن

اسمت روانگی

جلال آباد سے رخصتی کے بعد اسمت کے امیر مولانا رحمت اللہ صاحب نے مجھے بلا بھیجا تھا۔ مولانا البشیر پر میرے خیالات عیاں تھے۔ انھوں نے مجھے مولانا یوسفؒ کے نامکمل مشن کی تکمیل کے لیے مامور فرمایا۔ اور مجاہدین کے دو حصوں میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی تھیں انھیں دور کرنے کے لیے بھیجا۔ انھوں نے فرمایا کہ تم چمرکنڈ اور اسمت کے مابین ان شرائط کی بنیاد پر اتحاد کی کوشش کرنا جو مولانا یوسفؒ چمرکنڈ سے کر اسمس گئے تھے۔ اس لیے اب میں اس مشن پر اسمس جا رہا تھا۔ عید الفطر راستے میں آئی اور عید کے تقریباً ایک ہفتے کے بعد ہم اسمس پہنچ گئے۔

شرائط کی منظوری

اسمس میں مجھے مہمان کی حیثیت سے ٹھہرایا گیا اور میں نے جو شرائط بھی پیش کیں منظور کر لی گئیں۔ میری پہلی شرط یہ تھی کہ اسمس بالواسطہ فرنگی کے مقبوضات میں شامل ہے اس لیے آہستہ آہستہ یہاں سے بھائی لوگ ڈاک کے بہانے اسلحہ کے ساتھ چمرکنڈ بھیجا دیے جائیں جو بھائی ایک بار چمرکنڈ چلے جائیں وہیں مقیم رہیں اور چمرکنڈ سے ڈاک لے کر ایک دو بھائی سے زیادہ نہ آئیں۔ ادھر سے دس پندرہ بیس بھائی معہ اسلحہ جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اسمس کو خالی کر دیا جائے۔ اس طرح فرنگی کا معاہدہ صلح ختم کر دیا جائے۔
میری دوسری شرط یہ تھی کہ اس تبدیلی کے بعد جہاد کی مہم کو منظم کر کے نئے نئے محاذ

فرنگیوں کے خلاف قائم کیے جائیں اور قلمی جہاد تبلیغ اور اخبار کے ذریعے فرنگی کے رسوخ کو ختم کیا جائے۔ دراصل پہلی شرط ہی بنیادی شرط تھی۔ اس کے بعد اتحاد اور تنظیم تو خود بخود اس کے نتیجے میں حاصل ہو جاتے۔ میں تقریباً ایک ہفتہ یہاں مقیم رہا۔ اس دوران ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

حاجی فتح محمد کی وفات

بھائی حاجی فتح محمد جو گجرات پنجاب کے رہنے والے تھے اپنی اٹھتی جوانی میں جنگ طرابلس کے دوران اپنے وطن سے حج کے لیے گئے۔ ابھی وہ حجاز میں ہی تھے کہ جنگ طرابلس شروع ہو گئی۔ وہ اس جنگ سے بہت متاثر ہوئے اور کسی طرح محاذ پر پہنچ گئے۔ اس کے بعد وہ لشکر میں آ گئے۔ بہت سنجھے ہوئے سپاہی تھے۔ نیزہ بازی اور تلوار کے ماہر تھے۔ میانہ قد اور چاک و چوبند جسم تھا۔ لشکر میں بہت عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ پچھلے دنوں جلال آباد میں بھی میرے ساتھ کافی وابستگی کا اظہار کرنے لگے تھے۔ میں بھی ان سے بہت متاثر تھا۔ انھوں نے اپنا مختصر حال بیان کیا اور اپنے خاندان کے حالات معلوم کرنا چاہیے میں نے انہیں ان کے والد صاحب کے لیے ایک مختصر سی چٹھی لکھ دی اور جلال آباد میں قیام کا پتہ بھی لکھ دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ان کے والد صاحب کا جواب آیا جس میں انہوں نے جائیداد تقسیم کرنے کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ انہیں میدان جہاد سے نہیں روکنا چاہتے لیکن وہ اپنا جائیداد کا حصہ (جس کی قیمت سولہ ہزار پڑ رہی تھی) وصول کر لیں اور والد کو سبکدوش کر دیں۔ اگر رہنا نہ چاہیں تو حصہ فروخت کر کے واپس چلے جائیں۔ لیکن ان کا حصہ کسی دوسرے کو نہیں دینا چاہتے۔ اس لیے ایک بار آ کر اپنا حصہ لے لیں۔

اس خط کا جواب میں نے لکھ دیا۔ اس رات میری دعوت بھی حاجی صاحب نے کی۔ وہ پرندو نالہ (جو اسمس کے نیچے بہتا ہے۔ اور مہابرے کے مقام پر آ کر دریائے سندھ میں جا گرتا ہے) سے بائیس سیر کی ایک مچھلی شکار کر کے لائے تھے۔ پرندو میں چھوٹی بڑی

ہر طرح کی مچھلی ہوتی ہے۔ رات دعوت کھائی اور کافی باتیں ہوتی رہی۔ صبح جب نماز فجر کے لیے مسجد پہنچا تو معلوم ہوا کہ حاجی صاحب رات ایک بجے کے قریب بیمار ہوئے اور تین بجے کے قریب اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو گئے۔ صبح ان کے دفن سے فارغ ہو کر رات والے خط میں اتنا اضافہ کر کے بھیج دیا کہ اس خط کے لکھنے کے بعد حاجی صاحب بیمار ہو گئے۔ اور دو گھنٹے کی قلیل مدت میں فوت ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

باہمی اختلافات کا خاتمہ

اسمست میں یہ فیصلہ ہوا کہ میں ہندوستان میں جا کر انصار (ان لوگوں کو جو ہندوستان میں رہ کر ہماری مالی و دیگر امداد کیا کرتے تھے۔ جمر کنڈی صاحب نے ایک ملاقات میں بتایا کہ مولانا الیاس رحمتہ اللہ علیہ بانی تبلیغی جماعت بھی ہمارے انصار میں سے تھے۔ مرتب) کو اس امر سے آگاہ کروں کہ جمر کنڈ اور اسمس کی آپس کی چپقلش ختم ہو گئی ہے اور انصار کو بھی اب آپس میں شکر رنجی نہ رکھنی چاہیے۔ میرے ساتھ شیخ عبدالرحمٰن نو مسلم کو بھیجا گیا تھا امرتسر میں مولانا ثناء اللہ صاحبؒ امرتسری نے چنیوٹ کے تاجران چرم سے دو ہزار روپیہ وصول کر کے دیا وہ شیخ عبدالرحمٰن صاحب لے کر واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے بشیر صاحب کی طرف سے مولانا عبدالقادر قصوریؒ سے ملاقات کی۔ ان کو جماعت کے کوائف سے مختصر طور پر آگاہ کیا اور علی برادران سے امرتسر میں مختصر ملاقات ہوئی۔ ان سے میرا تعارف مولانا داؤد صاحب غزنوی کی معرفت ہوا۔ مولانا جوہرؒ صاحب نے مجھے دہلی آنے کی دعوت دی۔ دہلی جا کر میں نے غازی عبدالرشید صاحب کے پاس قیام کیا اور انہی کے ذریعہ مولانا جوہر صاحبؒ کی خدمت میں اطلاع کرائی۔ دو گھنٹے تک ان کی خدمت میں جماعت کے حالات پر تبصرہ ہوتا رہا۔ میں نے لشکری بھائیوں کی اس مشکل کو ان کے سامنے رکھا کہ فرنگی سرحدی چھاؤنیوں اور پلٹنوں میں ہندوستانی خصوصاً مسلمان سپاہ کو ہم سے لڑاتا ہے اور ہمارے ہاتھ اپنے ہم وطن اور خصوصاً اپنے ہم قوم سپاہیوں کو دیکھ کر سست پڑ جاتے ہیں اور اپنی

ہی طاقت زائل ہونے کا خوف ہمیں دل برداشتہ کر دیتا ہے۔ حالانکہ ہمارے مقابل آنے والے اس احساس سے عاری ہوتے ہیں۔ مولانا مجاہدین کے اس جذبہ ایثار سے بہت متاثر ہوئے اور رندھے ہوئے لہجے میں گویا ہوئے ایک آپ لوگ ہیں جو اسلام اور وطن کی خدمت کرتے ہوئے اس قدر نازک احساسات و جذبات کے مالک ہیں اور ایک ہم ہیں۔ کہ ایک دوسرے کی پگڑیاں اچھالنے سے ہمیں فرصت نہیں۔ یہ فرماتے ہوئے مولانا ظفر علی خان صاحب کا وہ خط میری طرف بڑھایا جو اس سے قبل میں مولانا غلام رسول صاحب مہرؔ سے سن چکا تھا جب میں اسی جذبے کو لے کر مولانا ظفر علی خان صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اور ان سے التجا کی تھی کہ آپ اپنے پریس سے اس آواز کو بلند کریں کہ سرحد پر فرنگی سپاہ متعین کی جائے۔ مولانا مہر ان دنوں زمیندار کے چیف ایڈیٹر تھے۔

اتباعِ رسولؐ

اتنی دیر میں کھانا آگیا اور مجھے بھی شامل کر لیا گیا۔ سالن دو تھے۔ حضرت مولانا نے فرمایا محمد علی کے دستر خوان پر مسنون طریق کارہ فرما ہے یعنی ایک ہی سالن تیار ہوتا ہے۔ یہ دوسرا سالن میرے نیک ہمسائے جب بھی پکاتے ہیں میرے لیے مفید جان کر بھجوا دیتے ہیں کیونکہ میں ذیابیطس کا مریض ہوں۔ اور یہ ذیابیطس والوں کے لیے مفید ہوتا ہے۔

سرحد واپسی

مجھے ہندوستان میں تقریباً پانچ ماہ گذرے ہوں گے کہ ۱۹۲۵ء کے نومبر کے آخر میں مولانا رحمت اللہ صاحب کا خط ملا کہ کابل میں اسمس کے نمائندوں اور بشیر صاحب میں کچھ اختلاف رونما ہو گیا ہے۔ مولانا نے اسمس کے نمائندوں کو صاف کہہ دیا ہے۔ کہ جب تک عبدالکریم یہاں آکر حالات میرے سامنے نہیں رکھتے میں تمہارے ساتھ کوئی بات یا معاملہ کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہوں۔ اس خط کو دیکھ کر میں پہلے اسمس کے لیے روانہ

ہو گیا۔ اس دفعہ میں نے طبیب کا سوانگ رچایا تھا۔ چند مجرب ادویات جو اپنے خاندان میں رائج تھیں اور چند کتابیں ایک بیگ میں رکھ کر چلا تھا۔ جب میں ہری پور پہنچا تو ٹریفک بند تھی۔ سر ہملٹن گرانٹ چیف کمشنر سرحد سیاسی شکار کے لیے مہابرے کے مقام پر تین دن قیام کر کے اور مدا خیل قوم کو شکار کرنے کے بعد واپس ہری پور پہنچنے والے تھے۔ میرا ٹانگہ کوئی دو گھنٹے تھانے کے قریب رکا رہا۔ لاٹھی والے سخت پہرہ اور نگرانی میں مصروف تھے خدا کے فضل و کرم سے مجھے بچ نکلنے کا موقع مل گیا۔

قبائل کا شکار

رات میں نے ایک جگہ سڑک کے کنارے بستی میں گذاری۔ دوسرے روز شام کے وقت مہابرے پہنچا۔ شام کے بعد میں نے مہابرے کی مسجد میں بستی کے چند معتبرین سے پوچھا یہاں کمشنر پشاور کس غرض سے آئے تھے؟ وہ بولے شکار کرنے۔ میں نے کہا اور وہ شکار کر گئے؟ پٹھان بہت ذہین قوم ہے وہ میرے فقرے کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ دربند اور سوات کے سنگم پر واقع ہیں اور دونوں ریاستیں ان کو اپنی رعایا بنا کر حکومت کرنے کی خواہاں ہیں۔ انہوں نے رعایا کی رعایا بن کر رہنے سے براہ راست حکومت وقت سے معاملہ کرنا بہتر سمجھا اور حکومت وقت سے معاملہ کر لیا ہے۔ اسی ذیل میں انہوں نے سوات اور دربند کی کچھ زیادتیوں کا ذکر کیا۔ خصوصاً ایک واقعہ کا ذکر کیا۔ جس میں دربند والوں کی طرف سے زیادتی کی گئی تھی۔ انہوں نے بتایا۔

دربند کی زیادتی

در عید الاضحیٰ کی نماز کے لیے ہم اس مسجد میں صف بستہ تھے۔ یہ مسجد دریائے سندھ کے دائیں کنارے واقع ہے۔ دریا کے پار دربند کا علاقہ ہے اور وہاں پہ بایاں کنارہ دائیں کنارے سے اونچا بھی ہے اس لیے ہم دربند کی بے پناہ زد میں ہیں۔ اس موقع پر دربند نے ہم پر توپ کے گولے برسائے اور ہمارے پینتالیس جوان موقع پر شہید ہو گئے

میں نے ان سے کہا کہ دربند والوں نے تمہاری جانوں کو زیان پہنچایا تھا مگر فرنگی تمہارے ایمان کو غارت کرے گا اور تمہیں بے ایمان کر کے ہلاک کرے گا۔

یہاں پر اس قوم کی حالت کا پس منظر بیان کرنا ضروری ہے تاکہ قارئین کو پتہ چل سکے کہ فرنگی کا طریق کار کیا تھا۔ اور کس طرح ان اقوام میں دجل اور فریب سے پنجے گاڑتا تھا۔

مداخیل

مداخیل قوم ایک بہادر قوم ہے۔ یہ دربند اور بنیر کے سنگم پر واقع علاقہ میں رہتی ہے اور دریائے سندھ کے دائیں کنارے مہابرہ ان کی مرکزی بستی ہے۔ بستی کے قریب ہی اوپر کے جانب برندو نالہ جو دریائے سندھ کا معاون ہے۔ دریائے سندھ میں گرتا ہے اور اسی نالے کے کنارے اور ارد گرد چڑھائی میں یہ قوم آباد ہے۔ دربند کا علاقہ دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر واقع ہے اور برندو نالہ بنیر کے علاقہ سے نکلتا ہے اس لیے مداخیل قوم بنیر سے زیادہ قریب اور ملحق ہے مگر بنیر میں کوئی ایسا شہر مداخیل کو قریب نہیں پڑتا۔ اس لیے یہ قوم اپنی ضروریات زیادہ تر دربند ہی سے خریدتی ہے۔ اس تعلق کی وجہ سے دربند سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ فرنگیوں نے اس قوم کو براہ راست زیر نگین کرنے کے لیے دربند کو زیادہ استعمال کیا۔

فرنگیوں کے مقاصد

فرنگی کا اصل مقصد مداخیل کو براہ راست زیر نگین کرنے سے یہ تھا کہ انہیں دربند اور سوات کے سروں پر تسلط قائم کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکے تاکہ یہ دونوں ریاستیں اور زیادہ محکوم ہو جائیں اور تسلط پائیدار رہے۔ اس غرض کے لیے قوم میں جاسوسی کا جال بچھا رکھا تھا۔ فرنگی کے یہ کارندے قوم کو اس ڈھب پر لانے کے لیے انہیں یہ تاثر دیتے رہتے تھے کہ سوات اور دربند کے ماتحت ہو کر ہماری عزت کو بٹہ لگ جائے گا۔

کیونکہ ہم رعایا کی رعایا بن کر رہ جائیں گے مگر براہ راست انگریز کے زیر نگین ہونے سے ہماری عزت سوات اور دربند کے برابر ہو جائے گی۔ اسی نظریہ کو مزید تقویت دینے کے لیے کبھی سوات اور کبھی دربند کی طرف سے ان لوگوں کو مرعوب کیا جاتا تھا۔ عید البقر کے روز عین نماز کے دوران دربند کی طرف سے حملہ اسی پروگرام کی ایک کڑی تھی۔ یہ غارت گری کروانے کے بعد چیف کمشنر شکار کے بہانے توم کو شکار کرنے کے لیے پہنچ گیا تھا اور قوم کو اس بات پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ مداخیل فرنگی کو براہ راست سرپرست بنانا قبول کر کے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیں۔ سر ہملٹن گرانٹ یہ کریڈٹ اپنے پلے باندھ کر جا چکا تھا اور میرے مہابرہ پہنچنے سے تقریباً ۳۲ گھنٹے قبل جب میں ایک بجے ہری پور پہنچا تو ہر طرف راستے بند تھے اور جاسوس ہری پور کے چپے چپے پر پھیلے ہوئے تھے۔ گرفتاری سے بچنے کے لیے میں نے ایک کرنے میں دیک کہ دوپہر بسر کی اور چار بجے ہری پور سے تانگے پر بیٹھ کر آگے روانہ ہوا۔ اور دوسری شام مجھے مہابرہ میں آئی جہاں مداخیل کا پورا پس منظر میرے سامنے ظاہر ہوا۔

میری پیشین گوئی

جب میں نے مداخیل کے نمائندوں کو کہا کہ فرنگی تمہارے ایمان برباد کرے گا تو وہ بولے کہ ہمارا تعلق فرنگی سے برائے نام ہوگا۔ ہم ان دو ظالم حکمرانوں (یعنی امب اور سوات) سے نجات پالیں گے۔ میں نے کہا۔ فرنگی کے آدمی یہاں ڈیرہ ڈالیں گے اور تمہارے علاقہ وزمین کو سرکاری زمین شمار کریں گے۔ جس سے خوش ہوں گے اس کو زمین دیں گے اور جس سے ناراض ہوں گے اس سے زمین چھین لیں گے۔ اس وقت تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگا مگر اس وقت تم ان سے چھٹکارہ نہ پا سکو گے۔ میں نے اپنی بات کا یقین دلانے کے لیے ان سے کہا کہ عنقریب فرنگی کے کارندے آئیں گے اور تمہاری زمین ناپ کر نقشہ بنائیں گے۔ قوم کے سرگردہ بولے۔ کہ ہم کسی کو اپنی زمین ناپنے کی اجازت نہ دیں گے۔

میرے ملنے آنے کے کچھ عرصہ بعد بیچ بیچ یوں ہی ہوا۔ فرنگی کی سرحدے ٹیم پہابرے پہنچ گئی۔ مداخیل کو اس وقت میری باتیں یاد آئیں۔ اور انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اب خطرہ ان کے گھروں میں داخل ہو گیا تھا۔ مگر قوم نے اتفاق کر کے سرحدے پارٹی کو سرزنش کر کے نکال دیا۔ فرنگی حکومت بظاہر خاموش رہی مگر پرانے حربے نئے سرے سے استعمال کرنے شروع کر دیے۔

مداخیل کی گرفتاری

مداخیل نے اس خاموشی کو غنیمت سمجھا اور عیدالفطر کے موقع پر مداخیل کے آدمی حسب سابق دربند میں اپنے آدمی عید کی ضروریات خریدنے کے لیے بھیجے۔ دربند والوں نے فرنگی کے اشارے پر مداخیل کے تیس آدمی گرفتار کر کے پشاور بھجوا دیے۔ فرنگی کے جاسوس اب دوبارہ خیر سگالی کے روپ میں قوم میں پھیل گئے اور قوم کو سمجھانا شروع کیا کہ تم لوگ ضد چھوڑ دو اور رعایا بن کر چین کی نیند سوؤ۔ قوم کے سرکردہ افراد فرنگی کی گرفت میں پشاور میں تھے۔ خاندانوں کے سربراہ قید میں ہونے کی وجہ سے صرف نوجوان لوگ ہی باہر تھے۔ خیر خواہوں کو یہ بتایا گیا کہ جب تک بڑے کوئی فیصلہ نہ کریں نوجوان کچھ نہ کر سکتے تھے فرنگی کے گماشتوں نے نوجوانوں کو آمادہ کیا کہ وہ ان کی ملاقات بڑوں سے کرا دیں گے اور وہ ان کو سمجھائیں۔ چنانچہ وہ چند نوجوانوں کو ملاقات کے لیے پشاور لے گئے۔ ملاقات ہوئی تو یہ قیدی اس ساری سازش سے باخبر ہو چکے تھے کہ دربند یا سرات والے ہمارے ساتھ جو زیادتیاں کرتے ہیں دراصل وہ فرنگی سرکے حکم اور اشاروں کی وجہ سے کرتے ہیں۔ انہیں یہ بھی پتہ چل گیا تھا۔ کہ دربند سے گرفتاری دربند والوں کی مجبوری تھی، شرارت اور فساد کی اصل جڑ فرنگی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی قوم کو ان نوجوانوں کے ہاتھ یہ پیغام دیا کہ اگر ہماری بوٹیاں کاٹ کر تمہارے سامنے چیلوں کو ڈال کر ڈال دی جائیں تو بھی تم قطعاً غمزدہ نہ ہونا اور نہ یہ خیال کرنا کہ ہماری رہائی کی خاطر فرنگیوں کی شرائط قبول کر لی جائیں۔

اس کے بعد ملا خیل کئی سال السے رہے۔ اُدھر اس طرف سے تو کسی نے اس غیور قوم کی حوصلہ افزائی کے لیے کچھ نہ کیا جب کہ فرنگیوں سے جاسوسی ہتھکنڈے اور روپیہ پانی کی طرح بہتا رہا۔ بالآخر بادل ناخواستہ ملا خیل کو فرنگیوں سے صلح کرنی پڑی۔

لشکروں کی صلح

مہابرے سے رخصت ہو کر تقریباً بارہ بجے میں اسمست پہنچ گیا اور دو تین دن کے بعد کابل پہنچا۔ میں یہاں مولانا البشیر صاحب کی قیام گاہ پر حاضر ہوا اور انہیں اسمست کے امیر صاحب سے اپنی گفتگو سے آگاہ کیا اور بتایا کہ انہوں نے میرے تمام مطالبات مان لیے ہیں۔ مولانا بشیر صاحب یہ کیفیت سن کر بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے مجھ سے رسید لے کر پچیس ہزار کابلی روپیہ میرے حوالے کر دیا۔ یہ روپیہ میں نے اسمس اور چمرکنڈ کے نمائندوں کو آدھا آدھا سپرد کر دیا۔ مولانا البشیر کو یہ روپیہ شاہ افغانستان نے تین ماہ کی رخصت پر جاتے ہوئے دو سال کے وظیفے کے طور پر دیا تھا اور مولانا صاحب نے شاہ سے وصول کر کے رحمت اللہ بہاولیں صاحب کے پاس امانت رکھا ہوا تھا۔ مولانا موصوف کا معاملہ شاہ افغانستان سے کسی واسطے سے نہیں۔ بلکہ براہ راست شاہ سے تھا۔

قائم مقام شاہ سے ملاقات

اس بار میرا تعارف افغانستان کے مرکزی سربراہوں سے بھی ہوا جن میں حضرت مولانا عبدالواسع صاحب سابق صدر قانون ساز اسمبلی افغانستان جو ان دنوں جیل سے رہا ہو کر کابل میں قیام پذیر تھے، سردار علی احمد جان جو امان اللہ خان کے بہنوئی اور کابل کے گورنر تھے، شامل تھے۔ میں ان سے جلال آباد میں متعارف تو ہو چکا تھا مگر ان کے نئے عہدے کی حیثیت سے ان سے تفصیلی ملاقات اب کابل میں ہوئی۔ ان دنوں امیر امان اللہ خان تین ماہ کی رخصت پر تھے۔ ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ان کی جگہ جنرل محمد ولی خان جو وزیر جنگ ہونے کی وجہ سے قائم مقام شاہ افغانستان

کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس ملاقات کا منظر اور پس منظر بڑا عجیب تھا۔ ایک طرف مولانا صاحب فرما رہے تھے کہ شاہِ افغانستان اس وقت ایک اخلاص کے پتلے سے معانقہ فرمائیں تو دوسری طرف یہ عاجز اپنے ان دنوں کو یاد کر رہا تھا جب وہ نوکروں کے نوکر یا ماتحت کی حیثیت سے زندگی کے دن گذار رہا تھا اور اپنے دل میں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا کاش اس نالائق نہ ہوتا تو وہی قوم ہے نوکروں کا نوکر۔

نوکروں کا نوکر

یہ واقعہ سنہ ۱۹۰۶ء کا ہے جب کہ نوکروں کے نوکر کا پس منظر سنہ ۱۹۰۹ء کا ہے۔ جب میں جماعت سوئم میں تھا۔ ایک وفادار بیوی کے کردار کے سبب میں نوکروں کا نوکر بنا۔ اس واقعہ میں جو سبق ملتا ہے اس کی بنا پر مجھے یہ قصہ نقل کرنے میں عار کی بجائے ایک حظ محسوس ہوتا ہے۔ اس سے اس زمانے کی وضعداری پر بھی روشنی پڑتی ہے اور انسانی تعلقات میں جو لطافت اور خوش اسلوبی پائی جاتی تھی۔ اس کا بھی اظہار ہوتا ہے قصہ مختصر۔

امرتسر کے ایک پریس مالک نے پریس مین کی اسامی کے لیے دہلی کے ایک سید احمد حسین کو منتخب کیا۔ وہ تیس روپے ماہوار پر دہلی سے مع اہلیہ امرتسر آ گئے تیس روپے اس وقت اچھی تنخواہ شمار ہوتی تھی۔ وہ اپنے کام کے ماہر ترین فرد تھے کچھ عرصہ کے بعد وہ بیمار ہو گئے۔ مرض نے طول پکڑا تو طویل بیماری کی وجہ سے نوکری نہ کر سکے کچھ عرصہ تو پس انداز اثاثہ سے کام چلا پھر بیوی نے اپنے زیورات سے وقت گزارا۔ جب کچھ نہ رہا تو بیوی نے شیخ اسماعیل صاحب دہلوی کے ہاں امرتسر میں جوتوں کے بڑے سوداگر شمار ہوتے تھے اس شرط پر نوکری کر لی کہ وہ اس بیمار خاوند کے علاج میں معاونت کریں گے۔ بیوی ایک سلیقہ شعار عورت تھی۔ شیخ صاحب موصوف نے اس بات کو بناء اور بیمار کے علاج کے لیے اپنے خاندانی طبیب جناب حکیم غلام جیلانی صاحب کی خدمات حاصل کیں۔ طویل بیماری کے باعث حکیم صاحب کو جتنا

وقت بیمار پر منعطف کرنے کی ضرورت تھی اس کا تقاضا تھا کہ مریض زیادہ وقت حکیم صاحب کے سامنے رہے۔ یہ بات شیخ صاحب موصوف کے بس سے باہر تھی اور حکیم صاحب اس غریب الوطن کے علاج سے دست کش نہ ہونا چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے شیخ صاحب سے کہا کہ اس مسئلہ کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ سید صاحب ان کے یہاں آ جائیں اور بوا صاحبہ ان کے گھر کے انتظام کو سنبھال لیں۔ اس طرح مریض کے جانبر ہونے کی صورت نکل آئے گی۔

وفادار بیوی نے اس پیش کش کو جو سراسر اخلاص پر مبنی تھی قبول کر لیا تھا اور وہ قبلہ حکیم غلام جیلانی صاحب کے ہاں جو میرے حقیقی ماموں تھے آگئیں۔ سید صاحب جب کچھ مہینے پر صحت یاب ہو گئے تو ماموں صاحب نے انہیں کہا کہ بوا صاحبہ گھر کی مالکہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں آپ مطب کا انتظام سنبھال لیں کیونکہ پریس کا کام جو مشقت کا ہے آپ سے نہ ہو سکے گا۔ سید صاحب انکار نہ کر سکے۔ تھے تو وہ نوکر اپنا ماہانہ بھی دونوں کا وصول کرتے مگر ان کے اختیارات مالکانہ تھے۔ اس طرح میں سید صاحب اور بوا صاحبہ کے نوکر کی حیثیت سے رہنے لگا۔ اور نوکروں کا نوکر بنا۔

غیر معروف راستہ

کابل میں کچھ روز قیام کے بعد راقم مولانا بشیر صاحب، چمرکنڈ اور اسمست کے ساتھیوں کے ہمراہ چمرکنڈ روانہ ہوئے۔ وہاں چند روز ٹھہر کر مولانا بشیر صاحب اور میں اسمست جانے کے لیے روانہ ہوئے۔ اسمست کے نمائندوں اور چمرکنڈ کے کچھ بھائیوں سمیت جو وطن واپس جا رہے تھے (یہ قافلہ سولہ افراد پر مشتمل تھا) تیسرے دن ہم بیاں کلی پہنچے۔ یہ یاغستان کا ایک تجارتی مرکز ہے۔ یہاں کے تاجر یاغستان اور چترال تک کے تحائف پشاور سے لے جاتے اور پشاور سے کپڑا اور دیگر ضروریات درآمد کر کے ارد گرد کے علاقوں میں برآمد کرتے ہیں۔ باقی قافلہ نے یہاں ایک دن قیام کیا اور میں حضرت مولانا

موصوف کے ہمراہ نواب منڈا (جو نواب دیر کے چھوٹے بھائی کا صدر مقام ہے) اسے ملنے کے لیے گیا۔ نواب صاحب موصوف بڑے احترام سے پیش آئے اور روایتی مہمانداری کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ واپسی پر اگلے روز ریاست دیر میں سے گذرنے کے لیے روانہ ہوئے مولانا صاحب کی معیت کے باعث اب کی بار ہم نے معروف راستوں کو چھوڑ کر غیر معروف اور پہاڑی راستوں کو اختیار کیا۔ دریائے دیر بھی پل کو چھوڑ کر ایک ایسی جگہ سے پار کیا۔ جہاں سرد موسم کی وجہ سے دریا میں پانی کم تھا۔ پھر بھی بڑا سرد پانی تھا۔ اور کمر تک پانی کو عبور کرنا پڑا۔ فرنگی نے ایک سڑک چکدرہ سے چترال تک دیر کے درمیان سے گذاری ہوئی تھی۔ تصادم سے بچنے کے لیے سڑک کے قریب سے بھی گذرنے سے گریز کیا۔ شام کے پانچ بجے کے کچھ بعد ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے۔ جہاں ایک چشمے سے تھوڑا تھوڑا پانی رس رہا تھا۔ وہاں ایک پہاڑی مکان بھی دکھائی دیا۔ سورج غروب ہونے میں آدھ گھنٹہ باقی تھا۔

مہمان نوازی

اس مکان کا مکین ہمارا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ جس راستے پر آپ رواں ہیں رات کے بارہ ایک بجے سے پہلے آپ کو کوئی آبادی نہیں ملے گی۔ اس لیے آپ کی نہایت مہربانی ہو گی اگر آپ رات غریب خانے کو رونق بخشیں۔ وہ سچ مچ ایک غریب شخص تھا۔ حتیٰ کہ اس کے پاس سب مہمانوں کو ایک ہی بار کھانا کھلانے کے لیے برتن بھی نہ تھے۔ اس نے چاول پکائے۔ اور ایک ہی برتن ہونے کی وجہ سے کھانا دو گروپوں میں کھایا جا سکا۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد حضرت مولانا نے فرمایا۔ اگر صبح بھی ہم لوگ ناشتہ کے لیے رک گئے تو اس کی پندرہ بیس روز کی خوراک ہم ختم کر جائیں گے اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم نے دو بجے رات وہاں سے رخصتی کی تیاری کر لی۔ میزبان یہ معلوم کر کے بہت افسردہ ہوا اور کہنے لگا کہ افسوس آپ میری غربت کی وجہ سے رات آرام کی بجائے سفر جاری رکھ رہے ہیں۔ تاہم رات کو اٹھ کر سفر کرنا ان علاقوں میں روایت

کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے یہ معیوب نہ تھا۔

جبری لنگر

علی الصبح ہم دیر کی ریاست عبور کرکے سوات کی حدود میں داخل ہو چکے تھے اور دریائے سوات کے دائیں کنارے اوپر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ حتیٰ کہ دن کے دس بجے دریا کے دائیں کنارے ایک جگہ کر ٹھا پہنچے۔ وہاں کے ایک زمیندار نے جس کو غالباً خان کوٹھا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا جبری لنگر جاری کر رکھا تھا یعنی کوئی شخص اس کی حدود سے کھانا کھائے بغیر گزر نہیں سکتا تھا۔ اس روز بد قسمتی سے خان موصوف قریب المرگ تھا۔ اس کے ورثاء جو لنگر کے منتظمین بھی تھے ہمارے لشکر سے واقف تھے۔ انہوں نے مولانا صاحب سے کہا کہ خان نزع کے عالم میں ہے اور ہم آپ کی مصروفیتوں سے واقف ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ جہاد سے متعلق کاموں میں خلل پڑے آپ کھانا کھا کر رخصت ہو جائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے یہاں ہوتے خان صاحب فوت ہو جائیں اور آپ کو تجہیز و تکفین کے لیے رکنا پڑے اور آپ کا کوئی زیادہ اہم کام رکنے کی وجہ سے ادھورا یا خراب ہو جائے۔ ہم نے گھی میں تیرتے ایک ایک انچ لمبے چاول جو پہلے سے تیار تھے تناول کیے اور اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ رات کو دریا کے بائیں کنارے پر بکوٹ شہر میں شب بسری کے لیے مقیم ہوئے۔ اگلے دن کڑاکڑ کی چوٹی عبور کرکے بنیر میں ایک رات بسر کی اور وہاں سے اگلے روز ساتویں دن ہم اسمس میں وارد ہوئے۔

بروقت انتباہ

ایک ہفتہ کے قریب اسمس میں گزرا۔ اس دوران میں مولانا بشیر صاحب رحمہ نے ہندوستان کی جماعت کے صحیح حالات پہنچانے کے لیے مجھے کچھ ہدایت دیں اور امیر شمس مولانا رحمت اللہ مرحوم نے مجھے جماعت کی نمائندگی کے لیے کام سونپا اور ہندوستان جانے کی تیاری کا حکم دیا۔ میرے روانہ ہونے سے قبل یہاں عبدالرحیم صاحب اور فضل الرحمن

بھائی روانہ ہو چکے تھے۔ میں چونکہ اس علاقہ سے پوری طرح باخبر نہ تھا اس لیے میرے ساتھ شیخ عبدالرحمن صاحب احمدانسس کے بھائیوں میں بہت ہوشیار سمجھے جاتے تھے نوشہرہ سے ریل میں سوار کرانے کے لیے بھیجا۔ میں جس وقت دروازے سے نکل رہا تھا مجھے فتح لالہ جو تناولی بھائیوں میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے ملے اور مغموم لہجے میں گویا ہوئے۔ بھائی عبدالکریم تم جا رہے ہو مگر یہاں سے تمہارے جانے کی خبر پیچھے پہنچ جائے گی جو تمہاری پریشانی کا باعث ہوا کرے گی۔ خدا ان کا بھلا کرے انہوں نے مجھے بالکل درست متنبہ کیا تھا۔

وطن روانگی

ہم جب ہوتی پہنچے اور نوشہرہ کے لیے روانہ ہو رہے تھے مجھے شیخ صاحب نے یہ کہہ کر کہ وہ سامنے مردان کا سٹیشن ہے گاڑی نوشہرے کو چھوٹنے ہی والی ہے تم جلدی سٹیشن پر جا کر گاڑی ایکڑ لو۔ مجھے چھوڑ کر وہ لوگ دو گیارہ ہو گئے۔ میں ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ ایک ٹانگے والے کی آواز سنائی تھی وہ پشتو میں نوخہرتہ نوخہرتہ کہہ رہا تھا جس کا مطلب تھا نوشہرہ جانے والے۔ میں نے ٹانگہ والے کو پوچھا کہ جب گاڑی سٹیشن پہ کھڑی ہے تو تم سواریوں کو نوشہرہ جانے کی آوازیں کس لیے دے رہے ہو۔ ٹانگہ میں ایک متمول پٹھان تھا وہ اور ٹانگے والا ایک زبان ہو کے بولے گاڑی تو اوپر کی جانب چکدرے کو جا رہی ہے میں لپک کر ٹانگے میں سوار ہو گیا۔ جب ٹانگہ نوشہرے کے قریب پہنچا تو پشاور کی طرف سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔ غالباً اسی گاڑی کے لیے دوسرا سوار ٹانگہ میں سوار ہوا تھا۔ چنانچہ وہ ٹکٹ گھر کی طرف لپکا۔ میں نے اس کو آواز دی کہ آپ رک جائیں اور مجھے بھی لاہور کا ٹکٹ لے دیجیے۔ اس نے کہا کہ یہ گاڑی لاہور کو نہیں بلکہ کندیاں جائے گی اور مجھے اس میں جانا ہے آپ کو دوسری گاڑی ملے گی جو پشاور سے کلکتہ کو جاتی ہے۔ اور وہ بارہ بجے رات کے قریب آئے گی۔ میں مسافر خانہ میں چلا۔

شام کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ میں مسافر خانے کے سامنے ایک چھوٹی سی مسجد میں گیا۔ اذان دی مگر کوئی نمازی نہ آیا۔ اسی طرح عشاء پر بھی کوئی نمازی نہ آیا۔ حالانکہ

یہ مسلم اکثریت کا علاقہ ہے۔ وقت کٹنی کے لیے سوچ بچار کے علاوہ اور کوئی مصدر نہ تھا۔ کبھی سوچتا کہ اگر میں مردان سٹیشن پر چلا جاتا اور ٹکٹ کلکر سے نوشہرہ یا کسی بائیس سٹیشن کا ٹکٹ مانگ بیٹھتا تو سرحدی ملازم جو عام طور پر سی آئی۔ڈی کا کام بھی کرتے ہیں۔ مجھے فوراً گرفتار کروا دیتا۔ شیخ صاحب نے میرے ساتھ یہ کیا مذاق کیا۔ کبھی اور کسی قسم کے خیالات آتے۔ شیخ الہ کا رخصتی نعرہ بھی یاد آتا۔ میں کچھ پیدل سفر کی تھکان سے نڈھال تھا اور کچھ مریض بھی تھا۔ مسافر خانے میں اکیلا پہلو پہ پہلو بدل رہا تھا کہ اتنے میں میری نظر ایک سپاہی پر پڑی۔ جو مجھے یوں گھور رہا تھا جیسے شکاری شکار کو تاک رہا ہو۔ اسی حالت میں وہ چلا گیا۔ اور تھوڑے وقفے کے بعد ایک اور سفید کپڑوں میں ملبوس شخص کو لایا۔ وقفہ وقفہ کے بعد یہ شغل جاری رہا۔ پھر جب کلکتہ میل کے ٹکٹوں کے لیے کھڑکی کے سامنے جمع ہوئے میں بھی کھڑکی کے سامنے پہنچا۔ اتنے میں ایک سپاہی اپنے ساتھی کو میری طرف اشارہ کر کے کہنے لگا "یہ ہے" گویا کہ یہی وہ شکار ہے۔ اس کے ساتھی نے مجھ سے پشتو میں پوچھا۔ کہاں جاؤ گے۔ لاہور میرا جواب تھا۔ میں نے پشتو لہجے میں اس سے اردو میں کہا۔ کہاں جاؤ گے۔ اس نے کہا۔ لاہور۔ اتنے میں گاڑی آگئی۔ وہ سب مجھے چھوڑ کر گاڑی دیکھنے چلے گئے۔ میں ٹکٹ لے کر تھرڈ کلاس کے پھاٹک کی طرف چلا گیا۔ پھاٹک ابھی بند تھا۔ میں نے ٹکٹ گھر واپس آ کر ٹکٹ بابو سے پوچھا۔ وہ کوئی شریف آدمی تھا۔ اس نے کہا کہ پشاور سے اس وقت تھرڈ کلاس مسافر نہیں آتا اس لیے وہ نہیں کھولا جاتا اور تھرڈ کے مسافر انٹر کلاس سے گذر کر ٹرین میں سوار ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالےٰ کی امان

میں انٹر کلاس کے راستے ٹرین میں داخل ہوا۔ پرلی طرف کی سیٹ پر جا بیٹھا

پڑا سورہا ہوں۔ گاڑی میں راولپنڈی تک کافی ہلچل رہی۔ مگر میرے رب نے مجھے محفوظ رکھا اور صبح جب میں امرتسر سٹیشن پر اترا تو بند دلال مجھے سرحدی پٹھان سمجھ کر اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دے رہے تھے۔ میں سیدھا اپنے گھر پہنچا اور لباس تبدیل کر کے سکون پایا

باب نہم

امرتسر واپسی

کئی ماہ کی غیر حاضری کے بعد جب میں گھر پہنچا تو سنہ ۱۹۲۶ء اپنے چار ماہ طے کر چکا تھا۔ میری بیوی اور والدہ کی خوشی بجا تھی کہ میرے بعد وہ اپنے گاؤں جانے پر مجبور ہو گئی تھیں اور وہاں انہوں نے چکی اور چرخے سے اپنی گذر بسر کی تھی اور میرے آنے سے چند دن پہلے امرتسر آ کر کس مپرسی کی کیفیت سے دوچار تھیں۔

ختنے کی تقریب

مولانا بشیر صاحب نے اسمت سے چلتے ہوئے کچھ رقم مجھے دی تھی۔ راستے کے خرچ وغیرہ کے بعد میرے پاس تقریباً ایک سو آٹھ روپے بچے تھے ان دنوں بھائی صاحب نے اپنے لڑکے کے ختنے کی تقریب رچا رکھی تھی وہ لہٰذا رقم جو میرے پاس تھی بھائی صاحب کے ٹھاٹھ باٹھ کی نذر ہو گئی۔ اگرچہ انہوں نے قرض کے نام پر لی تھی۔ مگر یہ رقم بھی ان چار سو روپے سے جا ملی جو بھائی صاحب کو میری بیوی نے کابل سے امرتسر بھیج کر بسر دکی تھی۔

ہماری معیشت بہت تنگی سے دوچار تھی۔ کئی وقت ہمیں بغیر کھائے گزر جاتے تھے شیخ بڈھا صاحب کی مسجد کے ساتھ وقف مکان کا ایک حصہ میرے پاس اوپر کی منزل میں میری بڑی ہمشیرہ صاحبہ رہائش پذیر تھیں۔ اس دوران مولانا بشیر صاحب کی طرف سے پیغام ملا کہ کاتب عبدالقدیر اور فضل الرحمٰن کو واپس بھیجو کہ اخبار کا کام رکا پڑا ہے مجھے علم نہیں تھا کہ کاتب عبدالقدیر نے فرنگی سی آئی ڈی سے ناطہ جوڑ لیا تھا اور وہ لشکر سے ایک بھائی محمد دین میرپوری کو ورغلا کر لشکر سے لے آیا تھا اور پشاور

میں گرفتار کرا چکا تھا۔ اب میری گرفتاری کی کوشش میں تھا۔ وہ چند روز قبل میرے پاس آیا تھا اور مجھے بتانے لگا کہ پولیس بہت تنگ کرتی ہے مگر ابھی تک میں نے تمہارا پتہ نہیں دیا۔ میں نے اس کو چھ روپے اور ایک جیبی گھڑی دی اور چمرکنڈ جانے کا مشورہ دیا۔ اور وہ مجھ سے بظاہر ٹل گیا۔ مگر میرے ایک چچازاد بھائی نے پولیس کے کام کو آسان بنا دیا۔

سی، آئی، ڈی

غالباً سی آئی ڈی کو کسی ذریعے سے پتہ چل گیا تھا۔ چنانچہ خفیہ پولیس کا ایک حوالدار شاہ دین جو مشہور سوشلسٹ لیڈر اور شاعر ظہیر کاشمیری کا والد تھا۔ میرے بھائی کی دکان پر آیا اور میرے چچازاد بھائی خیر محمد مرحوم سے کہنے لگا ہمارا کوئی عزیز کابل گیا تھا اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ ہم بڑے پریشان ہیں۔ میرا بھائی بولا میرا بھائی بھی کابل گیا تھا۔ وہ تو کئی دفعہ یہاں آیا ہے۔ آج کل بھی وہ یہیں ہے۔ اس نے کہا کہ تمہارا بھائی یہاں آئے تو اسے یہیں روکنا۔ تھوڑی دیر میں آ کر اس سے اپنے عزیز کے متعلق معلوم کروں گا۔ ہمارا ایک ہمسایہ سب گفتگو سن چکا تھا۔ شاہ دین کے چلے جانے کے بعد اس نے میرے بھائی کو بتایا کہ یہ تو خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ تم نے یہ کیا ظلم کیا۔ اب اپنے بھائی کو جتنی جلدی خبردار کر سکو کر دو۔ وہ دوڑا دوڑا گھر آیا۔ سب ماجرا مجھے سنا دیا۔ عجب اتفاق کہ اس دن میرے پاس فضل الرحمن صاحب، حافظ عبدالاحد صاحب، صوفی سلطان صاحب (حال صوفی عبداللہ صاحب منتظم و مہتمم مدرسہ اہل حدیث ماموں کانجن۔ آپ ۱۹۷۵ء میں وفات پا گئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۱۰۰ سال کے لگ بھگ تھی۔ اللہ تعالے ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ مرتب) اور شیخ عبدالرحمن چار مجاہد بھائی موجود تھے۔ میں نے فوری طور پر حافظ صاحب کو مسجد کو قوال چوک فرید میں قاری کریم بخش صاحب کے مدرسہ حفظ قرآن میں بطور طالب علم بھیج دیا۔ اور شیخ عبدالرحمن صاحب اور صوفی صاحب کو اسی وقت ملتان روانہ کر دیا کہ وہ ملتان جا کر مولانا عبدالتواب صاحب اور مولانا عبدالغفار صاحب

ناظمین مدرسہ اہل حدیث محلہ تدبیر آباد کو چمرکنڈ اور اسمست کے مرکزوں کے درمیان صلح کی خبر دیں۔ اسی طرح فضل الرحمن کو اس کے اپنے وطن بھاگ جانے کا مشورہ اور اخراجات دیے اور اپنے آپ کو فارغ کر کے دکان پر آیا۔ جہاں شاہ دین حوالدار ساتھ کی دکان پر بیٹھا میرا منتظر تھا۔

شاہ دین کی تفتیش

شاہ دین نے تکلف برطرف کرتے ہوئے مجھے صاف بتا دیا کہ اوپر سے اطلاع ملنے کی بنا پر مجھے تم سے پوچھ گچھ کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ اور اس نے یہ بھی بتایا کہ اطلاع کے مطابق تم تین آدمی تھے، تمہارے دوسرے دو ساتھی کہاں ہیں۔ میں نے جان لیا کہ فتح لالہ نے مجھے چلتے وقت جو اشتباہ کہا تھا وہ درست ہی تھا اور اطلاع غلط دی گئی تھی۔ غالباً مخبر نے خبر دیتے وقت غلطی سے خبر کو میرے حق میں مفید بنا دیا۔ میں نے اس غلط خبر سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کر کے یہ تسلیم کر لیا کہ ہم تین ہی آدمی تھے۔ مگر ایک تو گجرات کے سٹیشن پر اتر گیا تھا۔ اس کا اصلی نام مجھے علم نہیں۔ کیونکہ لشکر میں کسی کے اصلی نام کا علم کسی کو نہیں ہوتا۔ البتہ اس کا لشکری نام فضل الرحمن تھا۔ میں نہیں جانتا کہ کہاں کا باشندہ تھا۔ اتنا پتہ ہے کہ وہ گجرات کے سٹیشن پر اترا تھا۔ دوسرے صاحب کا بھی اصلی نام مجھے یاد نہیں۔ وہ بنگالی تھے اور ان کو حافظ صاحب کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ میرے ساتھ یہاں آئے اور رات ہمارے پاس ہی سوئے۔ اتفاق سے رات میرے اور میرے بھائی کے درمیان جو گفتگو وہ سن رہے تھے وہ یوں تھی۔ کہ میرے بھائی نے مجھے اپنے پیچھے چلنے کی تلقین شروع کر دی۔ میں نے ان کے پیچھے چلنے سے معذوری ظاہر کی تو بھائی صاحب نے مجھے دھمکی دی کہ میں پولیس میں خبر کر کے تمہیں مجبور کر دوں گا بہر حال رات تو جوں توں گزاری۔ صبح ہم دونوں نماز پڑھنے کے لیے گھر سے نکلے مگر نماز پڑھنے کے بعد اپنے ساتھی کو باوجود تلاش کے نہ پا سکا۔ جس کا مجھے از حد افسوس ہے۔ غالباً وہ گرفتاری کے خوف سے فرار ہو گیا۔ میں نے شاہ دین کو یہ تاثر دیا

کہ میں چمرکنڈ کھڈیاں بنانے کی غرض سے بلایا گیا اور جب کھڈیاں اور کارخانہ تیار کر دیا۔ اور اپنی مزدوری چاہی تو مزدوری لینے کی بجائے جان کا خطرہ لاحق ہو گیا اور جان بچانے کی خاطر میں چمرکنڈ سے بھاگ آیا۔

میری معاشی حالت

میرا یہ بیان لکھ کر شاہ دین تو چلا گیا مگر میری نگرانی شروع ہو گئی۔ اور میں بظاہر اً کچھ کاروبار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ میں اپنے ایک پرانے دوست مستری عبدالغنی صاحب سائیکل ساز کے پاس گیا اور انہوں نے مجھے سائیکل فریم تیار کرنے کا کام سونپ دیا۔ اس طرح سی آئی ڈی کا کام بھی آسان ہو گیا کہ مستری صاحب موصوف کی دکان کی رونق بھی بڑھ گئی۔ جلد ہی مستری صاحب کو پتہ چل گیا بلکہ وہ بظاہر سی آئی ڈی والوں کی معاونت کرنے لگے اس سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ میرے گھر کی نگرانی نرم پڑ گئی اور میں اپنا کام بھی ممکنہ حد تک انجام دیتا رہا۔ لشکر کے مجاہد مجھے ملتے اور میں حتی الوسع خدمت انجام دیتا رہا۔ مگر میری معاشی بدحالی قائم تھی۔ مستری صاحب سے مجھے بہت کم اجرت ملتی تھی جس سے بمشکل میری بیوی اور دو چھوٹے بچوں کا پیٹ پلتا۔

روس سے خط و کتابت

میں نہیں جانتا کہ سی آئی ڈی کو کس مسخرے نے یہ بتا دیا تھا کہ اس کی روس سے خط و کتابت ہے۔ حقیقت تو اللہ تعالٰے ہی جانتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اصل بات یوں ہے کہ لشکر میں جب تک میں تھا غیر ملکی سربراہوں خصوصاً امان اللہ خان شاہ افغانستان رضا شاہ پہلوی شاہ ایران، مصطفٰے کمال پاشا، صدر ترکی اور سٹریلین امیر روس کے نام لشکر کی خط و کتابت میرے ہاتھوں لکھائی جاتی تھی۔ کیونکہ خود حضرت مولانا البشیر صاحب خوشخط نہ تھے اور لشکر کے امیر حضرت مولانا فضل الٰہی اگرچہ اچھا لکھ لیتے تھے لیکن کبھی کبھار کے علاوہ ان کے خطوط بھی اکثر میں ہی کاپی کرتا تھا۔ اگر خط و کتابت کے متعلق فرنگی کو کوئی

خبر دے سکتا تھا تو وہ عبد القدیر ہی تھا۔ اوپر سے اطلاعات دینے والے اکثر ان الفاظ میں اطلاع دیتے کہ عبد الکریم سے خبردار رہیں۔ کیونکہ ان کو میری اس خدمت کا علم نہیں تھا

تحریر کا نمونہ

ادھر میرے حالات کا اندازہ لگائیے کہ جن دنوں امرتسر کی سی آئی ڈی کو روس سے خط و کتابت کا روگ لگا ہوا تھا انہی دنوں میرا کرتہ پھٹ رہا تھا گھر کے خرچ سے کسی طرح تیرہ آنے نکال کر میری قمیص کے لیے کپڑا خرید لیا گیا مگر اس کا اثر اتنا ہوا کہ ہم تیرہ دن تک دھاگے کی گولی کے لیے ایک پیسہ تک نہ نکال سکے۔ تیرہ دن بعد میں گولی لایا اور میری بیوی نے ہاتھ سے میری قمیص بنائی۔ انہی دنوں میں ایک دن مستری عبد الغنی کی دکان پر گیا تو مستری صاحب نے مجھے ایک خط لکھنے کی فرمائش کی کہ فلاں فرم کے نام خط لکھ دو کہ فلاں فلاں مال ہمیں بھیج دیں۔ اہل فرم مستری صاحب کے پرانے دوست تھے۔ میں نے نہایت اچھے انداز میں اچھی طرح صاف ستھرا مضمون اور اچھا خط لکھ دیا۔ جب میں یہ خط مستری صاحب کے ہاتھ پر رکھ رہا تھا تو حوالدار شاہ دین آگیا۔ اور اس نے آتے ہی وہ خط مستری صاحب سے تھام لیا اور بولا آپ کے خط کی ضرورت تھی سو وہ پوری ہوگئی۔ خط لے کر وہ چلا گیا تو مستری صاحب بولے کہ تم نے اپنی جان پر بڑے بڑے ظلم کر رکھے ہیں۔ کسی نے مخبری کی ہے کہ تمہاری روس سے خط و کتابت ہے اس لیے تمہارا خط حاصل کیا گیا ہے۔

سی، آئی، ڈی سے مذاق

ایک دن اتفاقاً مجھے مستری صاحب کی دکان پر پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ جب میں پہنچا تو مستری صاحب بڑے ہنس رہے تھے۔ میں نے ماجرا پوچھا تو بولے آج میں نے عجیب پارٹ ادا کیا ہے۔ میں نے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ابھی ابھی سی آئی ڈی کا آدمی آیا تھا۔ میں نے اس کو کہا کہ تم اب تک کہاں تھے۔ یہ وقت تمہاری ڈیوٹی کا ہے۔

میں تمہاری رپورٹ کردوں گا۔ تم اب آئے ہو تو وہ فرار ہو چکا ہے اب تم اس کو نہ پا سکو گے اور تمہاری روزی چھین جائے گی۔ وہ بہت سٹ پٹایا اور منت کرنے لگا۔ تم یہ مت کہنا کہ یہ دیر سے آیا ہے۔ بلکہ یہ کہہ دینا کہ وہ رات ہی کو فرار ہو گیا تھا۔ میں نے کہا آپ نے اس غریب کو پریشان کیا۔

انسٹی ٹیوٹ میں ملازمت

انہی دنوں محکمہ انڈسٹریز کا ٹیکسٹائل انسپکٹر مجھے ملا اور آداب عرض کے بعد بولا کہ کیا آپ اپنے پرانے محکمے میں کام کریں گے۔ ساٹھ روپے ماہوار ایک دو مہینے کام کر لیں معاشی بدحالی تو مجھ پر پہلے ہی مسلط تھی۔ میں نے سوچا چلو سی آئی ڈی کو کچھ تو دھوکا ہوگا ہی۔ اور ان کو ہاں کر دی۔ وہ بولے بس صبح دفتر کے وقت آ جانا۔ ویونگ انسٹی ٹیوٹ مستری کی دوکان سے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر ہوگا۔ چنانچہ اگلے دن صبح دفتر کے وقت پر انسٹی ٹیوٹ پہنچا۔

اب ۱۹۲۷ء کا آغاز تھا، سات سال قبل جب میں نے یہی ملازمت چھوڑی تھی تو میں ۲۶ روپے ماہوار لے رہا تھا۔ میرے کابل جانے کے بعد محکمے کی دنیا ہی بدل گئی تھی انسٹی ٹیوٹ میں صرف ایک کلرک جس کا نام غلام علی تھا۔ مسلمان تھا۔ باقی تمام ملازم ہندو تھے مجھے بھی عارضی طور پر مجبور ہو کر رکھا گیا تھا کیونکہ ان کا کام نہیں چل رہا تھا۔ اگرچہ یہاں بھی مجھے کچھ کام کے مواقع میسر آئے مگر اس کا تعلق ہندو مسلم سوال سے تھا۔ میرے سامنے مسلم مفاد تھا اور جب تک پاکستان قائم نہیں ہو گیا یہ چکر چلتا رہا۔

لیڈروں سے ملاقات

اسمست سے روانہ ہوتے وقت مولانا بشیر صاحبؒ نے جماعت کے صحیح حالات مولانا عبدالقادر صاحب قصوریؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا ثناء اللہ صاحبؒ اور بعض انصار جماعت تک پہنچانے کا کام میرے ذمے لگایا تھا۔ ۱۹۲۶ء کی گرمیوں میں پہلے مولانا قصوریؒ

پھر مولانا ظفر علی خانؒ صاحب اور اس کے بعد حضرت جوہرؒ صاحب کو جماعت کے حالات سے باخبر کر چکا تھا۔ مولانا ظفر علی خانؒ سے ملاقات سے پہلے مولانا غلام رسول مہر صاحب اور عبدالمجید سالک صاحب مرتضےٰ احمد خان میکش جو کابل سے وزیرستان ہوتے ہوئے لوٹے تھے۔ اور کچھ اسلحہ بھی لائے تھے۔ ان سب اصحاب سے بڑی مفید ملاقات ہوئی۔ اسی دوران سی آئی ڈی کو مجھ سے شکایت پیدا ہوئی اور انھوں نے حضرت مولانا نور احمد صاحب سپردری کا (جو بہت بڑے علماء میں شمار ہوتے تھے اور میرے مہربان اور ہمسایہ بھی تھے) سے شکایت کی یہ شخص ہمیں بہت خراب کرتا ہے۔ جب اس نے دہلی جانا ہوتا ہے تو مشہور کر دیتا ہے کہ میں لاہور جاؤں گا ہم اسے لاہور میں تلاش کر کے پریشان ہو رہے ہوتے ہیں اور یہ دہلی کی سیر کر رہا ہوتا ہے اس کے برعکس لاہور جانے سے پہلے یہ دہلی کی سیر کی دعوت دیتا ہے۔ بات یہ تھی کہ مجھے محکمانہ طور پر پابند نہ کرتے تھے بلکہ خفیہ نگرانی رکھتے تھے اور میرے لیے یہی طریق نگرانی الٹا مفید تھا۔

عبدالقدیر کی سازشیں

اسی دوران عبدالقدیر جو کہ مولانا فضل الٰہی صاحب کا پیر منشی تھا۔ مجھے پھر ملا اس نے مجھے بتایا کہ خفیہ پولیس مجھے تنگ کر رہی ہے کہ میں انہیں جماعت کے متعلق خبریں مہیا کروں۔ میں تمہارا نام بتا دوں گا۔ اس سے کچھ دن پہلے مجھے ایک چٹھی ملی تھی جس میں فضل الرحمٰن پولیس میں اور عبدالقدیر کاتب کو طلب کیا گیا تھا۔ یہ اچھا ہوا کہ مجھے یہ چٹھی دیر سے ملی۔ عبدالقدیر میرے پاس آنے سے پہلے بھائی محمد دین کو جو خوج سے فرار ہو کر سمہ بند رق لشکر مجاہدین میں آئے تھے، دھوکے سے گرفتار کروا چکا تھا۔ اب عبدالقدیر چاہتا تھا کہ وہ مجھے بھی گرفتار کروا دے۔ پولیس کسی بہانے کی تلاش میں تھی۔ جو اسے اب تک میسر نہ تھا۔ لیکن جب سے پولیس کو میری تحریر کا نمونہ مستری عبدالغنی سائیکل ساز کے ہاتھوں مل چکا تھا۔ میں بے حد محتاط ہو گیا تھا۔ کئی مواقع پر مجھے یہ کہا گیا کہ مولانا بشیرؒ کی چٹھی تمہارے پاس تھی۔ اور مجھے زبانی پیغام بھی دیا ساتھ ہی مجھے مولانا موصوف

کے لیے کچھ لکھ کر دینے کے لیے کہا۔ تاہم میں محتاط رہا اور کوئی خط کسی کو بھی نہ دیا۔

زبانی پیغام

ایک بار ڈاکٹر رشید الدین صاحب مجھے ملے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف علی احمد جان کے پرسنل اسسٹنٹ بھی تھے اور ڈاکٹر بھی۔ وہ امرتسر کے رہنے والے تھے۔ امرتسر میں ان کے بھائی کی ٹیکسٹائل فیکٹری بھی تھی اس وجہ سے وہ میرے واقف اور گاہک بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب مجھے بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ جب مجھے امان اللہ خان کے خلاف بغاوت فرد ہونے کے بعد خدمات کے صلے میں خلعت پہنائی جا رہی تھی۔ اس وقت یہ خدمت ڈاکٹر صاحب موصوف ہی کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے مولانا بشیر صاحب کا پیغام دیا۔ اور بتایا کہ ان کا خط وہ مصلحتاً ضائع کر چکے تھے اور یہ کہ اگر میں مولانا کے نام خط دینا چاہوں تو وہ ان کو پہنچا دیں گے۔ میں نے کہا کہ اگر خدانخواستہ وہ خط دشمن کے ہاتھ لگ گیا تو آپ کو بہت نقصان کا اندیشہ ہو گا۔ اندیشہ انگیز کرنے سے بہتر یہی ہے کہ آپ میرا پیغام زبانی ان تک پہنچا دیں۔

ایک اور چال

بنگال کے ایک بھائی حبیب الرحمٰن نامی جو اسمست کے امیر کے داماد بھی تھے، میرے پاس ٹھہرے اور مجھے قصہ سنایا کہ ایک مقام پر خطرہ پیدا ہو گیا تھا چنانچہ میں نے مسجد کے غسل خانے میں جا کر مولانا کا تمہارے نام خط کھا لیا تھا۔ انہیں بھی میں نے یہی جواب دیا کہ میں آپ کو مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ زبانی پیغام ہی کافی ہے۔ اس دوران مجھ میں اور پولیس میں ایک طرح کا مقابلہ چل رہا تھا۔ کہ فضل الرحمٰن صاحب ایک ناواقف کو ساتھ لے کر آن وارد ہوئے رحب سے نگرانی شروع ہوئی۔ میں اپنے گھر پر کسی کو نہیں ٹھہراتا تھا۔ ویسے تو مدرسہ عزیزیہ اور کچھ دیگر مقامات بھی تھے۔ مگر مدرسہ حفاظ جو قاری کریم بخشؒ کی تولیت اور چوک فرید مسجد کو توال میں جاری تھا۔ ان مقامات میں سے ایک تھا۔ حافظ عبدالاحدؒ صاحب

بھی وہیں مقیم تھے۔ فضل الرحمٰن صاحب مسجد ہی میں آن ٹھہرے۔ انہوں نے اس ناواقف کے بارے میں بتایا کہ یہ بہت تنگ حال اور پھٹے کپڑوں میں مدرسہ رحمانیہ دہلی میں مجھے ملا تھا۔ میں نے اس کو جہاد کی ترغیب دی اور اب یہ چمرکنڈ جاکر جہاد میں شمولیت کے لیے بے چین ہے اور میں اسے چمرکنڈ لے جانے کے لیے یہاں لایا ہوں۔ میں نے کہا کہ تمہیں یہ تو معلوم تھا کہ پولیس میرے پیچھے لگی ہوئی ہے پھر تم یہاں کس لیے آئے۔ فرمانے لگے خرچ کے لیے۔ میں نے اس جواب سے جانا کہ جناب نے ساتھی کو میرے متعلق بتا دیا ہے کہ امرتسر میں ہمارا ایسا مرکز ہے جہاں سے ہمیں سب کچھ مل سکتا ہے۔ میں نے فضل الرحمٰن کو بتایا کہ یہ فرنگی کا آدمی ہے جو تمہیں پھانس کر یہاں لایا ہے اور تمہاری نادانی سے نہ صرف تم بلکہ اور لوگ بھی گرفتار ہو جائیں گے۔ وہ بولے واہ جی میں نے اس کو بہت تنگ حال میں پایا۔ اس کو اپنے کپڑے تک دے دیے۔ یہ دیکھو خود پھٹے کپڑے پہنے ہوں۔ بھلا ایسا ہو سکتا ہے میں تو اسے چمرکنڈ پہنچاؤں گا۔ میں نے اس شخص سے ملاقات کی اس کی باتوں سے میرا شک مضبوط ہو گیا مگر فضل الرحمٰن صاحب اپنی ہٹ پر قائم رہے۔ ادھر میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ لاچار ہو کر میں اس ناواقف شخص سے پھر ملا اور اسے سمجھایا کہ میری طرف دیکھو وہاں کی مصیبتوں سے تنگ آکر میں خود وہاں سے فرار ہو کر آیا ہوں۔ تاہم اس نے چمرکنڈ جانے ہی کو ترجیح دی۔ میں نے اس سے قرآن شریف پر حلف لیا کہ وہ میری بابت کسی کو نہیں بتائے گا۔ یہ دو تین دن یہاں ٹھہرے۔

فضل الرحمٰن کی گرفتاری

فضل الرحمٰن صاحب نے اس عرصہ میں مدرسے کے ایک طالب علم خلیل صاحب کو بھی چمرکنڈ جانے کے لیے تیار کر لیا۔ خلیل صاحب حافظ عبدالاحد صاحب سے بہت متاثر تھے۔ جو اس مسجد میں طالب علم بن کر مقیم تھے۔ کسی کو کیا معلوم کہ اس مرکز کی کیا حیثیت تھی جماعت کا اگر کوئی چندہ ہوتا تھا تو وہ سب کا سب بھیج دیا جاتا تھا۔ میں نے اپنی والدہ سے ذکر کیا۔ انہوں نے اپنے کانوں کی طلائی بالیاں مجھے دے دیں جو پچاس روپے

میں گروی رکھ کر رقم فضل الرحمٰن صاحب کے حوالہ کی اور وہ حافظ خلیل اور اپنے ساتھی کو لے کر روانہ ہو گئے۔ حافظ خلیل صاحب کے دور کے واقف کار مولوی عبدالغفور صاحب جو مولانا پسروری کی خدمت میں موذن کی حیثیت سے مسجد شیخ بڈھا میں مقیم تھے۔ پتہ چل جانے پر ریلوے سٹیشن پر پیچھا کرنے گئے۔ حافظ خلیل صاحب تو نہ رکے مگر یہ خبر کافی مشہور ہو گئی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ پولیس کو اس بات کی کوئی خبر ہوئی یا نہیں کچھ دیر تک تو ہمیں کوئی اطلاع نہ ملی۔ تقریباً دو ہفتے کے بعد یہ خبر ملی کہ فضل الرحمٰن صاحب اور خلیل صاحب در بند کے قریب کر بلیاں آخری سرحدی پولیس چوکی پر گرفتار ہو کر پشاور لے جائے گئے ہیں۔ ان پر دفعہ ۱۰۹ لگائی گئی جو ضمانت دینے پر قابل رہائی ہے۔ یہ خبر یوں ملی کہ فضل الرحمٰن کی تسلی دینے کے باوجود خلیل صاحب نے اپنے احباب اور اپنے والد صاحب کو لکھا۔ ان کے والد صاحب خلیل صاحب کو ضمانت دے کر رہا کرا لائے مگر فضل الرحمٰن صاحب ضمانت نہ دے سکنے کے باعث عدالت میں پیش ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد معلوم ہوا کہ فضل الرحمٰن صاحب دو سال کے لیے قید کر دیے گئے ہیں۔

محمد دین کی سزایابی

فضل الرحمٰن صاحب کی سادگی اور لاپرواہی کی داد دینا چاہیے کہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے دو سال بعد رہا ہوئے تو سیدھے امرتسر تشریف لائے اور جیل میں محمد الدین بھائی، حنیف مستری بھائی اور چار پانچ اور بھائیوں کی گرفتاری اور قید کا احوال سنایا۔ اور ساتھ ہی ان کے لیے جوتیاں مہیا کرنے کا فرمان دیا۔ ان کو چار یا پانچ جوڑے خرید دیے اور ان کو جلد رخصت کر دیا گیا۔ محمد دین کے متعلق پتہ چلا کہ ان کو فوج سے مع بندوق فرار ہوتے کے الزام میں چار سال کی سزا ہوئی۔ پولیس کے کارکنوں کی غفلت کی وجہ سے مع ہتھکڑی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر بدقسمتی سے پھر گرفتار کر لیے گئے۔ جج صاحب کوئی رحم دل انسان تھے جنہوں نے محمد دین کا یہ موقف قبول کر لیا کہ مجاہدین اسے بنکٹ سے گرفتار کر کے لے گئے تھے۔ اور یہ کہ وہ کئی سال

مجاہدین کی کڑی نگرانی کے باعث مجبور مجاہدین میں رہا اور آخر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس بیان کو جج نے مان لیا ورنہ وہ سزائے موت سے کم سزا نہ پاتا۔

فضل الرحمن کی لاپرواہی

اپنے متعلق فضل الرحمن نے بتایا کہ سزا کاٹنے کے دوران پشاور خفیہ پولیس کے انچارج میاں عبدالعزیز نے کئی دفعہ اپنے دفتر میں بلایا اور بعزت سے پیش آیا۔ ساتھ ہی پولیس کے کارکنوں کو ڈانٹا کہ مولوی صاحب کو ہتھکڑی لگا کر نہ لایا کرو۔ اور مجھے اپنے ساتھ کرسی پر بٹھا لیا۔ مجھے محبت سے کہا کہ مولوی صاحب آپ قید کی تکلیف مفت میں بھگت رہے ہیں۔ حالانکہ اگر آپ عبدالکریم (یعنی راقم) کے متعلق پولیس کو ٹھیک ٹھیک بتا دیں تو آپ کو قید کی بجائے فائدہ بھی مل سکتا ہے۔ مگر میں نے کہا کہ میں اسے نہیں جانتا۔ یہ ڈرامہ کئی بار ہوا کیونکہ وہ مجھے ہر دو ماہ کے بعد بلا لیتا اور یہی پیش کش کرتا۔ فضل الرحمن کا یہ بیان سن کر اس کی لاپرواہی دیکھتے ہوئے مجھے بے اختیار ہنسی آگئی اور میں نے کہا بندہ خدا پھر تم سیدھے یہاں آگئے ہو اور اگر وہ تمہارے پیچھے اپنا کوئی آدمی لگا دیتے وہ ہنسا اور لاپرواہی سے کہنے لگا تو پھر کیا ہو جاتا۔

گرفتاری کا واقعہ

یہاں میں اس کی گرفتاری کا قصہ بھی بتاتا چلوں جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس نے کس درجہ ناسمجھی کا ثبوت دیا تھا۔ اس نے اپنی گرفتاری کا واقعہ یوں سنایا کہ سٹیشن پہنچنے کے بعد اس کا وہ ساتھی جس پر شبہ تھا۔ اس نے کہا کہ میں اپنی والدہ کو مل آؤں لاہور کا پتہ دے دو۔ دوسرے دن وہاں پہنچ جاؤں گا۔ وہ اگلے دن لاہور نہ پہنچا۔ اس اثناء میں اس نے یقیناً ان کے پروگرام کے بارے میں مخبری کر دی ہو گی۔ یہ دونوں یعنی فضل الرحمن اور خلیل صاحب جب سٹیشن پہنچے تو ٹکٹ لیتے وقت خلیل صاحب کو پتہ چل گیا کہ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس نے فضل الرحمن کو خطرے سے آگاہ کیا

وہ حسب عادت بولا کچھ پرواہ نہیں، فکر نہ کرو۔ ریل گاڑی میں بھی خلیل نے سمجھایا کہ ہمارا پیچھا ہو رہا ہے مگر اس نے پرواہ نہ کی۔ یہ دونوں حسن ابدال سٹیشن پر عشاء کے وقت اترے تو ٹکٹ بابو نے انہیں روک لیا۔ اس موقع پر ایک صاحب نے جو ان کی نگرانی کرتے چلے آ رہے تھے۔ ٹکٹ بابو کو ڈانٹا اور کہا کہ شریف آدمیوں کو تنگ نہ کرو۔ علی الصبح وہ ہری پور روانہ ہو گئے۔ ہری پور میں تانگے والے کو سرحد کی طرف چلنے کے لیے صبح چار بجے کا کہا۔ دونوں ندی تک تانگے پر گئے اور دربند کی طرف پیدل چلے۔ راستے میں آخری چوکی کربلیاں پر وہی صاحب جنہوں نے حسن ابدال سے چھڑایا تھا۔ ان کے منتظر تھے اور گرفتار کر لیا گرفتار کرنے کے بعد سارا قصہ سنایا کہ ہم تو کئی روز سے آپ کی نگرانی کر رہے تھے۔ بالآخر آپ ہمارے دام میں آ ہی گئے۔ خلیل بول پڑا کہ آپ نے لاہور یا حسن ابدال میں کیوں نہ پکڑا۔ وہ بولا۔ ہمارا مقدمہ کمزور رہتا۔ یہاں گرفتار کر لینا مقدمے کی پختگی کے لیے ضروری تھا۔ خلیل کا خیال ٹھیک تھا کہ ان کی نگرانی ہو رہی تھی۔ سادہ دل لوگ بھی انقلابی تحریکوں کے لیے وبال جان بنتے ہیں وہ اپنے لیے بھی مصائب کھڑے کرتے ہیں اور پوری تنظیم کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ کارِ جہاد میں سمجھداری اور فراست مومنانہ کی بے حد ضرورت ہے۔ ہر چند ہماری جماعت میں ایسے سادہ لوگ بہت کم تھے لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ افراد ایسے نکل ہی آتے ہیں جن کا خلوص اعلےٰ پائے کا لیکن عقل ادنیٰ درجے کی ہوتی ہے۔

گرفتاری کا بہانہ

فضل الرحمٰن کی باتیں سن کر کہ پشاور کی خفیہ پولیس میرے بارے میں مسلسل تحقیقات کر رہی ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا میں سمجھتا تھا کہ اگرچہ میں انتہائی احتیاط اور رازداری سے اپنے کام کو جاری رکھ رہا ہوں۔ لیکن یہ صورت حال دیر تک چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ امرتسر پولیس کا نگرانی کا عملہ مجھے یہ کہا کرتا تھا کہ ہمیں تم کیوں پریشان کرتے ہو۔ اوپر سے ہمیں متواتر تنبیہ کیا جاتا ہے کہ اس کی کڑی نگرانی رکھو۔ ہم لکھ کر بھی دے چکے ہیں کہ یہ

شخص بالکل کچھ نہیں کر رہا۔ وہ سارا وقت محنت کر کے بفضل اپنی روزی حاصل کرتا ہے مگر اوپر سے متواتر تاکید آتی رہتی ہے۔ ورنہ ہم تو تمہاری نگرانی سے اکتا چکے ہیں۔ کچھ یہی وجہ بظاہر میری گرفتاری میں ہچکچاہٹ کی ہو سکتی تھی۔ تا آنکہ۔ آخر وہ وقت آ ہی گیا جب پولیس کو غلط سہی لیکن ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔ تاہم چونکہ وہ بہانہ سراسر غلط تھا اس لیے اللہ تعالےٰ نے اپنی رحمت سے اس جال کا تار تار بکھیر دیا۔

باب دہم

شاہی قلعہ

دسہرہ بم کیس

ستمبر ۱۹۲۸ء میں لاہور دسہرے کے موقع پر شاہی مسجد کے سامنے بارہ دری اور روشنی دروازہ کے قریب ایک بم کا دھماکہ ہوا۔ بم جرمنی کا بنا ہوا اور نہایت خطرناک تھا۔ پچاس سے زیادہ افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ بم کے اجزاء کا تجزیہ کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ بم ان بموں کے ہم جنس ہے جو ۱۹۲۰ء میں کوٹ قاضی ضلع گوجرانوالہ میں قاضی عبدالرؤف نمبردار اور جیرین کو اپرٹو بنک کے یہاں سے پکڑے گئے تھے۔

کوٹ قاضی کا مقدمہ

مجاہدین کا ایک حصہ جو چمرکنڈ میں مقیم ہو گیا تھا۔ انگریزوں کے خلاف مہمند اور باجوڑ کے مقام اتصال پر واقع ہیڈکوارٹرز سے پورے سرحد میں جہاد کی تحریک کی رہنمائی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ مولانا بشیرؒ تے جو تحریک مجاہدین کی روح رواں تھے سنہ ۱۹۲۰ء کے شروع میں ایک منصوبہ بنایا کہ پورے ہندوستان میں قسط دار اسلحہ جمع کیا جائے۔ وہ کئی قسطوں میں رائفلیں کارتوس اور بم بھیجتے رہے۔ اسی سلسلے میں احمد نامی ایک مجاہد کے ہاتھ ایک ٹرنک میں کچھ بم اور دیگر اسلحہ کوٹ قاضی میں بھیجا گیا۔ تاکہ مناسب وقت پر یہاں سے منتقل کر لیا جائے۔ اس اثناء میں مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی جو ابھی ہندوستان کے اندر مجاہدین کے ایک اہم رکن کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے وہاں پہنچ گئے۔ ٹرنک کو زمین کے اندر گڑھا کھود کر

احمد کے سامنے دفن کر دیا گیا۔ احمد کے سامنے ٹرنک دفن کرنا ایک شدید غلطی تھی۔ احمد کوٹ قاضی سے کچھ روپیے لے کر اپنی والدہ کو دینے کے لیے اپنے گاؤں ضلع فیروزپور جا رہا تھا کہ فیروزپور شہر سے گزرتے ہوئے ایک جگہ پیشاب کرنے بیٹھ گیا۔ ایک سپاہی نے اسے دیکھ کر آواز لگائی۔ اب بجائے اس کے کہ احمد وہیں موجود رہتا، سپاہی کو دیکھ کر بھاگ پڑا۔ سپاہی نے پیچھا کیا۔ سپاہی تازہ دم تھا۔ اس نے احمد کو جا لیا۔ جب بدقسمتی آگے تو غلطیوں پر غلطیاں سرزد ہونے لگتی ہیں۔ اول تو احمد کا بھاگنا ہی غلط تھا۔ پھر جب سپاہی قریب پہنچا تو احمد نے پستول نکال کر سپاہی کو ڈرانے کے لیے ہوا میں فائر کیا۔ سپاہی نے اس غلطی کا فائدہ اٹھایا اور احمد کو جا دبوچا۔ کچھ اور لوگ بھی سپاہی کی مدد کو پہنچ گئے۔ احمد بے بس ہو کر گرفتار ہو چکا تھا۔ پھر پوچھ گچھ پر تشدد کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور سب کچھ بتا دیا۔ چنانچہ پولیس اس کو ساتھ لے کر قاضی کوٹ پہنچی اور اس مقام کو کھود کر جہاں ٹرنک دفن تھا سب اسلحہ برآمد کر لیا۔ احمد پہلے ہی پولیس کو مطلوب تھا۔ اس پر سرحد میں انگریز افسروں کو تنگ کرنے اور قتل و غارت گری کا الزام تھا۔ مقدمہ چلا اور احمد صاحب چودہ سال کے لیے قید کر دیے گئے۔ قاضی عبدالرؤف صاحب کو قید کے علاوہ ضبطی جائداد کی سزا ہوئی۔ مولانا فضل الٰہی صاحب ان دنوں بنگال کے دورے پر تھے اور ان کو وہیں اس واقعہ کی اطلاع ملی۔ وہ وہیں سے بھیس بدل کر چھپتے چھپاتے مہاجرین میں شامل ہو کر چمرکنڈ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان دنوں ہجرت کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔

جماعتِ مجاہدین کی تشہیر

ایک چھوٹی سی غلطی سے منصوبہ بھی ناکام ہو گیا اور دشمن کو کئی بے گناہوں کو پکڑنے کا موقع فراہم ہو گیا مگر ایک عظیم فائدہ بھی اس کے نتیجے میں حاصل ہوا کہ رولٹ ایکٹ کو جائز قرار دینے کے لیے حکومت نے اس واقعہ کو بڑا اچھالا نتیجتہً یہ جماعت مجاہدین جو سرا سر ہوز سربستہ تھی ہندوستانی لیڈروں اور انقلاب پسندوں کی حوصلہ افزائی

اور ان کی تائید کا مرکز بن گئی۔ اس سے جماعت کے ارادوں پر روشنی پڑی اور انگریزوں کے خلاف جذبات مزید ابھرے۔

عوام اس واقعہ کو بھول چکے ہوں گے۔ یہ آٹھ برس پہلے کی بات تھی۔ تاہم اس دھماکے اور اس کے تجزیے کے نتیجے میں ایک بار پھر مجاہدین پر عتاب نازل ہونے کا بہانہ پولیس کے ہاتھ آگیا۔ اس بار صورت حال یوں تھی کہ۔ ع

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

قرعہ فال میرے نام نکلا

فرنگیوں کے خیر اندیشوں اور کچھ ہمارے مہربانوں نے یہی خیال کیا کہ ہو نہ ہو یہ عبدالکریم (یعنی حقیر راقم) کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ اس دھماکے کے واقعہ کو تقریباً ایک ماہ گزر چکا تھا۔ میں نے چوک فرید کے قریب ایک چھوٹے سے لکڑی کے کام کے کارخانے کا ڈھونگ رچا رکھا تھا۔ تین چار آدمی جو اس میں کام کرتے وہ کارخانے کے مالک اور حصہ دار تھے۔ ان کے ساتھ یہ معاہدہ تھا کہ فائدہ میں حصہ دار اور نقصان سے بری الذمہ تھے۔ چند ماہ قبل حافظ عبدالاحد صاحب کی شادی امرتسر سے قریب بارہ میل محلانوالہ ایک گاؤں میں ایک بیوہ کے ساتھ کردی گئی تھی۔ میں کبھی کبھی ان کی طلبی پر جاتا رہتا تھا۔ میں دو دن کی غیر حاضری کے بعد واپس آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ لاہور سے پولیس آئی ہوئی ہے اور وہ دو تین بار پتہ کر کے گئے ہیں۔ ابھی آنے والے ہوں گے میں ابھی اپنے گھر نہیں گیا تھا۔ میں پولیس کی آمد اور گذشتہ واقعات پر غور کر رہا تھا پولیس کی آمد غیر متوقع نہ تھی۔ واقعات کا تقاضا یہی تھا۔ آخر ایک نہ ایک دن یہ ہونا ہی تھا چنانچہ امرتسر پولیس کے چند سپاہی اور دو حوالدار لاہور قلعہ کی سپیشل پولیس کے ایک انسپکٹر اور ایک حوالدار کے ہمراہ آگئے۔ انسپکٹر صاحب نے پوچھا یہاں پر عبدالکریم کون ہے۔ میں نے کہا وہ میں ہوں۔ وہ بولے اور چراغ دین۔ وہ بھی میں اور کرم الٰہی وہ بھی میں۔ انہوں نے کہا تمہارے مکان کی تلاشی مطلوب ہے۔ میں نے کہا چلیے

انہوں نے دو سپاہیوں کو حکم دیا کہ تم یہاں ٹھہرو۔ کوئی شخص جو یہاں موجود ہے اپنی جگہ سے نہ ہلے نہ اندر جائے اور نہ اندر سے کوئی شخص باہر آئے۔

پولیس کی تلاشی

پولیس کے ساتھ مکان کو جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا۔ خدایا ایک فریق جس کو آپ نے اس قدر وسعت بخشی ہے کہ اس کی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا اور دوسری طرف تیرا ایک حقیر اور عاجز بندہ۔

اللھم انا نجعلک فی نحورھم نعوذبک من شرورھم

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جنگ میں یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔ میں اس صورت حال کو جنگ ہی سمجھتا تھا۔ یہ دعا میری زبان پر تھی۔ حوالدار ایک ہندو ایک سکھ تھا سپاہی ملے جلے تھے اور لاہور قلعہ کے پولیس انسپکٹر اور حوالدار دونوں مسلمان تھے۔ مکان پر پہنچے تو میری ایک بھاوج بھینس دوہ رہی تھی۔ مکان بڑا تھا۔ اس میں دو حقیقی بھائی ایک ماموں زاد بھائی اور دو ہمارے چچازاد بھائی رہ رہے تھے۔

ایک سکھ حوالدار جلدی سے مکان میں داخل ہونے لگا تو میں اس کے آگے کھڑا ہو گیا۔ اور کہا کہ یہ مکان پردے دار ہے۔ دروازے کے بالکل ساتھ میری بھاوج دودھ دوہ رہی ہے۔ جب تک اندر سے اطلاع نہ جائے کہ آجاؤ میں آپ کو اندر جاتے نہیں دوں گا پھر میں نے آواز دی کہ پولیس مکان کی تلاشی لینے کی غرض سے آئی ہے آپ پردہ کرلیں اتنے میں محلے کا نمبردار ایک عورت کو لے کر آگیا جو عورتوں کی تلاشی کے لیے بلوائی گئی تھی خفیہ پولیس کے انسپکٹر خواجہ تاج دین صاحب کچھ شریف انسان ہی تھے۔ سپاہیوں کو انہوں نے روک کے رکھا حتیٰ کہ اندر سے والدہ صاحبہ نے آواز دی۔ پردہ ہو گیا ہے آجاؤ۔ اندر جا کر خواجہ صاحب نے اٹنشن کی پوزیشن میں آکر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

فردِ جرم

تم پر دفعہ ۱۶۴ کے تحت لاہور دسہرہ کے موقع پر بم کا دھماکہ کرنے اور اس میں بارہ اشخاص کے قتل اور ایکٹ اسلحہ کے ماتحت مقدمہ چلے گا۔ یہ عملہ جو تلاشی لینے آیا ہے۔ تم ان کی تلاشی لے سکتے ہو۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ آپ کے قانون کے مطابق اگرچہ میں تلاشی لینے کا حق رکھتا ہوں۔ مگر میرے لیے آپ کے قانون کچھ مفید نہیں ہوں گے اگر آپ نے مجھے پھانسنے کے لیے اقدام کیا ہے تو پھر آپ نے اس کا انتظام کر لیا ہو گا اور اگر ایسا نہیں تو جو کچھ میرے پاس ہے وہ آپ کے سامنے آجائے گا۔ اتنے میں شام کی اذان ہو گئی اور میں نے نماز ادا کرنے کی مہلت چاہی۔ مجھے وہیں نماز ادا کرنے کی مہلت مل گئی۔

نماز پڑھنے کے بعد دوبارہ تلاشی ہوئی اور میں نے عملے کے ساتھ یوں تعاون کیا جیسے میں ان کا ایک ساتھی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور احسان کا ذکر ضروری ہے۔ دو چیزیں جو میرے حق میں سخت نقصان دہ تھیں۔ پولیس کی پارٹی کو نظر نہ آئیں۔ ان میں سے ایک تو وہ تمغہ غیرت تھا جو حکومت افغانستان کی طرف سے بغاوت فرد ہونے کے بعد مجھے ملا تھا اور دوسری وہ انگوٹھی تھی جس پر عبدالکریم خوشخط کندہ تھا۔ یہ انگوٹھی کابل میں وظیفے کی رسید پر مہر کی حیثیت سے استعمال کی گئی تھی۔ مکان کی تلاشی کے بعد دکان پر آ کر دکان یعنی کارخانے کی تلاشی ہوئی۔

شاہی قلعے کے لیے روانگی

محلہ کے چوہدریوں کی تصدیق وغیرہ کے بعد مجھے کہا گیا کہ آپ کو ہمارے ساتھ لاہور قلعے میں جانا ہو گا۔ میں نے ایک کمبل لے لیا اور ساتھ روانہ ہو گیا۔ میرے بڑے بھائی صاحب میرے معاملہ میں فطری طور پر دلچسپی لے رہے تھے وہ ریلوے سٹیشن تک ساتھ آنا چاہتے تھے میں نے ان کو کہا آپ ایسا نہ کیجیے یہی بہتر ہے ایسا نہ ہو کہ

آپ بھی لپیٹ میں آجائیں۔ بھائی صاحب نے میری بات مان لی۔ ہر چند کہ ان کا جی یہی چاہتا تھا کہ سٹیشن تک میرے ساتھ چلیں۔ سٹیشن پر آ کر خواجہ صاحب نے پوچھا کہ کس درجے میں سفر کرو گے۔ میں نے کہا انٹر میں۔ اپنی ٹکٹ کے پیسے میں نے دے دیے۔ لاہور آ کر خواجہ صاحب خود تو اپنی رہائش گاہ پہ چلے گئے اور مجھے حوالدار کے حوالے کر گئے۔ حوالدار نے آسٹریلیا بلڈنگ میں دوسری منزل پر ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ رات وہیں گزری صبح حوالدار کے ساتھ قلعے کو روانہ ہوا۔ اگرچہ حوالدار باوردی نہیں تھا۔ مگر میں نے اس خوف سے کہ بازار میں سے گزرتے ہوئے کوئی واقف یا دوست نہ بلالے کسی جانب دھیان کیے بغیر سر جھکائے بازار سے گزرا۔ خدا کی رحمت شامل حال رہی کہ کسی سے ملاقات نہ ہوئی میرا یہ طرزِ عمل پہلے گزرے ہوئے حالات کی روشنی میں تھا۔ ایک بار امرتسر میں اپنے ایک رشتے دار کو جو جوتوں کا کاروبار کرتا تھا۔ خندہ پیشانی سے سلام کیا تھا۔ اس کے پاس ٹھہرا بھی نہ تھا۔ جب دوسرے دن وہاں سے گزرا تو اس نے کہا کہ آپ نہ بلایا کریں کیونکہ کل جب تم ہنستے ہوئے مجھے سلام کر کے گذرے تو خفیہ پولیس کے سپاہی میرے ہمسایوں سے میرے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے تھے کہ یہ کیسا آدمی ہے۔ بہر حال قلعے میں جا کر معلوم ہوا کہ خواجہ تاج دین انسپکٹر پولیس ہی کو میری تفتیش سونپی گئی ہے۔

بیان پر غور

میں نے رات اپنے معاملے پر غور کر لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں کوئی بیان نہ دوں اور صاف صاف اپنی برطانیہ دشمنی کے اظہار پر اکتفا کروں مگر یہ خودکشی کے مترادف ہوتا کیونکہ پولیس نے الزام ایسا تراشا تھا جس پر سزائے موت کے سوا کسی اور شکل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے میں نے ایسے بیان کا فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی دوسرے شخص سے پوچھ گچھ کا امکان ہی پیدا نہ ہو سکے۔

انشراحِ صدر

انسپکٹر نے پہلا سوال یہ کیا کہ آپ کا والد کیا کرتا تھا اور ساتھ ہی کہا کہ سچ بولنا۔ میں چونکا مگر ساتھ ہی مجھے انشراحِ صدر کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ اللہ کا خاص احسان تھا۔ میرا کام آسان ہو گیا۔ میں نے اپنے والد کے احوال کو خوب طول دیا پھر اپنی سکول لائف اور ادھوری تعلیم اور یتیمی کا ذکر کر کے پھر انڈسٹریل مڈل کی دربدری اور پھر سرکاری ملازمت اور انگریزوں کے مقاماتِ مقدسہ کے بارے میں عہد شکنی کی وجہ سے ملازمت چھوڑنے کا ذکر کیا۔ یہ بھی بتایا کہ میں مولانا احمد علی صاحبؒ کے قافلے میں شامل ہو کر کابل گیا تھا ہجرت کے وقت میری بیوی سِل کی مریضہ تھی حتیٰ کہ اس کے بچنے کی امید نہ تھی۔ انسپکٹر نے بہت زور دیا کہ میں مولانا موصوف کے متعلق ان کی معلومات میں اضافہ کا باعث بنوں۔ بلکہ مجھے یہاں تک دھمکی دی کہ تم دوسروں کے جرائم پہ پردہ ڈالنے کے لیے اپنے پھنسنے کے امکان کو نظر انداز کر رہے ہو یہ تمہارے حق میں برا ہو گا۔ میں نے کہا میں بالغ تھا۔ اخبارات خود پڑھتا تھا اس لیے میں کسی ترغیب کا شکار نہیں ہوا بلکہ اپنی صوابدید کے مطابق ہجرت کا اقدام کیا۔ ایسی صورت میں کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے اقدام کی ذمہ داری اوروں پر جھوٹ موٹ تھوپ دوں۔ حالانکہ آپ نے خود مجھ سے سچ بولنے کا عہد لیا تھا۔ کابل بھیج کر کھڈیاں بنانے کی غرض سے چمرکنڈ جانا اور وہاں کھڈیاں اور کارخانہ بنا کر مزدوری کا مطالبہ کرنے اور مزدوری نہ ملنے پر وہاں سے فرار ہونے کا وہی قصہ جو میں نے ابتداء میں امرتسری اے ڈی کے عملے کو دیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان آ کر کھڈیوں اور بندوق سازی کا سامان لے جانے کے لیے اپنی آمد و رفت کا ذکر کرتے ہوئے اپنے بھائی کے بچاؤ کے لیے ایک سچی بات بیان کر کے اپنے بھائی کو اپنا مخالف ثابت کر کے اس کا بچاؤ کیا بھائی نے مجھے واپس نہ جانے کے لیے پولیس میں رپورٹ کی دھمکی دی تھی۔ اس کو خوب واضح کیا۔ واپسی پر مجبوری کے لیے میں نے یہ کہا۔ کہ میرے ساتھ سراج دین صاحب آئے تھے (وہ اس وقت تک جیل میں وفات پا چکے تھے) انہیں یہ حکم تھا کہ اگر میں کسی طرح ان کی

بات نہ مانوں اور کوئی غلط اقدام کرنے کی کوشش کروں تو وہ مجھے گولی ماردیں۔ یہ جھوٹ تھا جو میں نے اپنا جرم مانتے ہوئے اس کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے گھڑا تھا۔

قلعہ کی تفتیش

پانچ چھ دن بیان لکھوانے کے بعد مجھے خان بہادر عبدالعزیز سپرنٹنڈنٹ انچارج سپیشل پولیس کے پاس لایا گیا جو میرا بیان دیکھ چکے تھے۔ وہ بولے تو آپ مولانا فضل الٰہی کے ساتھی ہیں۔ میں نے کہا ساتھی نہیں بلکہ باغی۔ یہ سن کر انہوں نے مجھے تو رخصت کر دیا اور اپنے عملے کے دو حوالدار ایک ہندو اور دوسرے مسلمان کو میرے پیچھے لگا دیا کہ وہ مجھ سے راز حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ قلعہ میں میرا یہ آخری دن تھا جو سارا دن تقریباً تفریح میں گذرا۔ ہندو حوالدار مجھے مشتعل کرنے کے لیے ایران میں اپنی کارگذاریوں کے جھوٹے قصے سناتا۔ مقصد یہ تھا کہ میں اس کی تردید میں کچھ کہوں اور میں تقریباً سکول ماسٹر کا رول ادا کرتا جو نو آموز طلبہ کو الفاظ کے ہجے بھی بتاتا جاتا ہے میں نے انہیں اپنا بیان اسی انداز میں لکھوایا۔ انہیں یہ آرڈر ملا تھا کہ وہ مجھ سے راز حاصل کریں لکھتے جائیں ساتھ ہی میں ان کو اس بات سے بھی آگاہ کرتا کہ غلام لوگ علم اور عقل سے زیادہ چغلخوری کی عادت یا مہارت سے روزی حاصل کرتے ہیں۔ یہ ان کے کام پر طنز تھی لیکن وہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے یہ کچھ کر رہے تھے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے پہلی آزمائش سے نکالا۔

مختلف شہادتیں

دھماکے کے واقعہ کے متعلق میں نے اپنی بے خبری اور بے تعلقی کے لیے امرتسر میں اپنی اس دن کی مصروفیت کے متعلق کچھ شہادتیں لکھوا دی تھیں۔ ان کی تصدیق کے لیے ایک اور ہندو حوالدار کو میرے ساتھ امرتسر بھیجا گیا۔ جس نے امرتسر آکر شہادتیں لیں جو بالکل میرے بیان کے مطابق درست تھیں۔ سب سے اہم شہادت امرتسر سی آئی ڈی

کی نگرانی کی شہادت تھی۔ اتفاق سے میں رات کے دو بجے تک ایک سکھ سردار کے سنیاری سٹور میں کام کرتا رہا تھا اور سی آئی ڈی کا آدمی رات دو بجے کے بعد مجھے گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر گیا تھا۔ سکھ دکاندار اور سکھ مستری جو کام میں ناکام ہو کر مجھے اپنی امداد کے لیے لے گیا تھا سب کی شہادت میرے حق میں تھی۔ پھر وہ حوالدار میرے بھائی کے تکیے میں گیا اور وہاں تلاشی بھی لی۔ میرا سب سے بڑا بھائی فقیر ہو گیا تھا۔ اور امرتسر سے دو میل باہر گلوالی نام ایک گاؤں میں رہائش پذیر تھا۔

دوبارہ تفتیش

ابھی مجھے لاہور سے لوٹے ایک مہینہ گزرا تھا کہ میں پھر محلانوالہ سے حافظ صاحب کو مل کر امرتسر پہنچا تو مجھے اطلاع ملی کہ لاہور قلعہ سے پولیس آئی ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ میرے بہی خواہوں کو یقین تھا کہ یہ ضرور سزائے موت پائے گا ان کو جب یوں بچ نکلنے کی خبر ہوئی تو انہوں نے پولیس کو سمجھایا کہ اگرچہ خود عبدالکریم نے یہ دھماکا نہیں کیا مگر یہ کام اسی کا ہے۔ اس کو خود ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے پاس آدمی بہت ہیں وہ کسی سے بھی یہ کام کروا سکتا تھا۔ چنانچہ اب کے تفتیش کی ذمہ داری پولیس کے ایک پرانے اور تجربہ کار انسپکٹر جو امرتسر کٹڑہ سنگھ کے رہنے والے تھے اور خواجہ حسن نظامی کے مرید تھے کے سپرد ہوئی۔ وہ ملزم کا جرم پکڑنے کے لیے مراقبہ سے مدد لیا کرتے تھے۔

قلعے میں روزے

اب دوبارہ کارخانے اور مکان کی تلاشی لی گئی جو حسب سابق خیر سے گذر گئی۔ لاہور قلعہ آنا ہوا۔ چوہدری شہاب دین قلعہ ہی میں قیام پذیر تھے۔ جس کمرے میں وہ مقیم تھے اسی کے ایک کونے میں مجھے بستر ڈالنے کی جگہ دی گئی۔ بستر اور جانماز کے لیے ایک ہی مقام تھا۔ ایک مسلمان حوالدار میری ضروریات کا انتظام کرنے پر مامور کر دیا گیا اگلے دن شعبان شروع ہو رہا تھا۔ میں نے حوالدار کو سحری کے لیے دودھ اور ڈبل روٹی

لانے کے لیے رقم دی اور صبح روزہ رکھ لیا۔ ایسے وقتوں میں دعا اور نماز کا عجیب سماں ہوتا ہے چنانچہ میرے لیے یہ موقع بہت غنیمت ثابت ہوا اور میں نے اس سے مقدور بھر فائدہ اٹھایا اور ہر روز روزہ رکھنا لازم کر لیا۔ حدیث شریف میں شعبان کے پہلے پندرہ دن روزہ رکھنا مسنون بھی ہے۔

میری سرگذشت

اب چوہدری صاحب نے سابقہ بیانات دیکھ کر مجھ سے سوال کیا کہ تم نے بیانات سے تو دفتر بھر دا دیے مگر اس میں پلے کچھ نہیں پڑتا جو بھی نام تم بتاتے ہو وہ یا تو مر چکا ہے یا ہماری حدود سے باہر ہے ہم آگے کیسے چلیں۔ میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ایسے اشخاص کا نام بتاؤں اور زندہ بھی ہوں اور آپ کی دسترس میں بھی ہوں چاہے وہ جھوٹ ہی کیوں نہ ہو۔ اور چاہے کوئی بے گناہ ہی اس میں کیوں نہ پھنس جائے۔ میں نے جو سرگذشت لکھوائی ہے وہ صحیح ہے۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ میرے جواب سے مطمئن ہوئے یا نہیں وہ مراقبے میں بیٹھ گئے۔ میں نے اللہ تعالےٰ سے دعا کی گڑگڑایا خدا کی امان چاہی۔ خدا ہی جانے چوہدری صاحب کو کیا نظر آیا کہ وہ مجھ سے متاثر دکھائی پڑے تھے۔ پھر انہوں نے مختلف مقدمات میں اپنی کامیابیوں کا تذکرہ شروع کر دیا۔

تناسخ کا مسئلہ

اسی بارے میں ایک ٹریجڈی کا ذکر کیا کہ ملتان میں ایک ملزم کے ساتھ مجھ سے زیادتی ہو گئی۔ اس کی بددعا سے میرا جوان بیٹا فوت ہو گیا۔ کہنے لگے کہ جلدی ہی میں تناسخ کا قائل ہو گیا۔ میں نے پوچھا وہ کیسے بولے کچھ دیر کے بعد مجھے ایک ہندو منجم نے بتایا کہ آپ کا جو لڑکا فوت گیا تھا وہ دوبارہ آپ کے ہاں جنم لے گا اور نشانی یہ بتائی کہ اس کے جسم پر اسی جگہ داغ ہو گا جہاں اس کے زخم کا نشان تھا۔ چنانچہ جب لڑکا پیدا ہوا

تو اس کے جسم پر اس جگہ داغ تھا۔ جہاں مرنے والے کے جسم پر داغ تھا۔ ساتھ ہی یہ آیت پڑھی کیف تکفرون باللہ الخ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا ہے۔ میں نے کہا۔ قرآن مجید لامتناہی سلسلے کا نہیں بلکہ ایک دفعہ مرکر دوبارہ زندہ ہوکر خدا کے آگے جواب دہی کے لیے لوٹائے جانے کا ذکر کرتا ہے۔ اور یہ کہ جو آپ نے بچے کے جسم پر داغ ہونے کو تناسخ کا عمل سمجھ لیا ہے بالکل غلط ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ یورپ میں حاملہ کے رہنے اور چلنے پھرنے کے مقامات پر بہادروں اور خوبصورت جوانوں کی تصویریں لٹکانے کا رواج ہے۔ اس کی مصلحت یہ ہے کہ حاملہ جن تصورات کو اکثر سامنے رکھے گی۔ بچے میں وہ اشکال خواص پیدا ہوں گے۔ ایک فرنگی عورت کے یہاں لڑکا ہوا جو بہت گورا نہ تھا۔ اس کے خاوند نے اس پر شبہ کیا اور کہا کہ بچہ میرا نہیں۔ عورت سمجھ دار تھی بولی کہ آپ مجھے ایک حبشی کا فوٹو مہیا کردیں۔ اگر بچہ ہوبہو تصویر جیسا نہ ہو تو آپ میری گردن مار دیں۔ اس سے بھی واضح مثال شاہ دولہ کے چوہوں کی دیکھیے، عورت کے بچہ نہیں ہورہا۔ وہ گجرات میں شاہ دولہ کے مزار پر جاتی ہے اور منت مانتی ہے کہ اگر میرا بچہ ہوا تو اسے مجاور کے طور پر دے گی اور اس کا بچہ بالکل اسی شکل کا پیدا ہوتا ہے۔ چاہے عورت کا خاوند کتنا ہی خوبصورت اور جوان ہو۔ آپ کی بیوی کو یقین تھا کہ بچہ کے جسم پر فلاں جگہ داغ ہوگا۔ پس وہ داغ پیدا ہوگیا۔

چوہدری صاحب کا مراقبہ

چوہدری صاحب نہ صرف مطمئن ہوگئے بلکہ اپنے ایمان کو ٹھیک اور پختہ کرلیا۔ وہ میرے کچھ عقیدت مند بھی ہونے لگے۔ میری ریاکاری نماز اور روزے رکھنا بھی اس کی وجہ بنا۔ وہ جب بھی میرے کیس کے بارے میں کوئی نئی بات مجھ سے کہتے میں جہالت کا مظاہرہ کرتا۔ انہوں نے مجھے کہا تم بہت پردہ داری سے کام لیتے ہو۔ ہمارے پاس ایسے آدمی ہیں جو تمہاری شخصیت کو پوری طرح جانتے ہیں۔ وہ آدمی عنقریب تمہارے سامنے آکر تمام حالات بتادے گا۔ پھر کیا ہوگا۔ یہ سوچ لو اور ہمیں سچ سچ حالات بتادو

ایک سب انسپکٹر اس آدمی کو لینے گیا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ جس آدمی کو آپ پیش کریں گے اول تو وہ میرے سامنے آئے گا ہی نہیں اور اگر آیا تو آپ خود دیکھ لیں گے کہ وہ بات بھی کر سکتا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ آدمی آگیا ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ میرے سامنے نہ ہوا۔ اس طرح میری یہ تجربت کامیاب رہی۔ جب بھی چوہدری صاحب میری بابت مراقبہ کرتے پہلے سے زیادہ عقیدت مند ہو جاتے۔ تاہم وہ تفتیش سے دستبردار نہ ہوتے اور مراقبے کی مدد سے اور دیگر مختلف انداز سے بات چیت کر کے اپنا اطمینان کرتے رہتے۔

ایک تجویز

تقریباً دس دن کی تگ و دو کے بعد ایک دن خود چوہدری صاحب ان کے سینئر انسپکٹر سید احمد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نیاز احمد اور خواجہ تاج دین چاروں اکٹھے میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور کہنے لگے ہم سمجھتے ہیں کہ آپ کو تو سزائے موت سے شہادت کا مرتبہ ملے گا ہی۔ ہمیں بھی دس ہزار روپیہ انعام میں مل جائے گا۔ آپ کو تو کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ آپ تو شہید ہوں گے۔ جو بہر حال ہونا ہے کیونکہ سزائے موت سے ورے آپ کو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ میں نے کہا یہ ایک سودا ہے جو مفت نہیں ہو سکتا۔ آپ چاروں مل کر مجھے پانچ ہزار نقد دیں۔ وہ میں اپنے بچوں کو پہنچا دوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں تختہ دار پر بھی یہ راز فاش نہ کروں گا۔ اور اگر آپ فیصلہ کر چکے ہیں کہ مجھے سزائے موت ہی ہونا چاہیے تو میں آپ کو اپنا موقف واضح طور پر بتا دوں۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ دھماکے سے ۵۲ افراد پبلک کے ہلاک ہوئے۔ ان میں کوئی حکومت کا آدمی نہ تھا ہمارے نظریے کی رو سے پبلک پر وار کرنا پرلے درجے کی شقاوت اور کمینہ پن ہے اور مجھے اس الزام سے سخت کوفت لاحق ہے۔ چہ جائے کہ میرا اس میں کسی قسم کا تعاون شامل ہو۔ اس کے باوجود اگر آپ اپنا فیصلہ بدل نہیں سکتے اور مجھے سزائے موت دینا ہی اپنا مقصد قرار دے چکے ہیں تو مجھے مسٹر سانڈرس کے قتل کے الزام میں رکھ لیں۔ آپ کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ اور میرا بوجھ ہلکا کہ پبلک پر وار کا الزام تو نہ ہو گا۔ وہ

لاجواب ہو کر چلے گئے۔

"مسٹر سانڈرس فرنگی نژاد پولیس کپتان تھا جو مسٹر سکاٹ پولیس کپتان کے شبہ میں بھگت سنگھ پارٹی کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا اور ابھی تک گرفتاری عمل میں نہیں آئی تھی۔"

زمیندار کا جادو

اس سے اگلے ہی دن اتفاق سے ایک نیا شوشہ اٹھا۔ اس دن مجھ سے بہت بڑی غلطی کا ارتکاب ہو گیا۔ ۱۹۲۹ء شروع ہو چکا تھا۔ کہ امان اللہ خان والی افغانستان بچہ سقہ کی بغاوت سے بے بس ہو کر تخت سے دست بردار ہو کر قندھار چلا گیا تھا۔ اس کے بھائی عنایت اللہ خان کو جس کو امان اللہ خان حکومت سونپ گئے تھے۔ ملاں کے شور بازار نے نکال دیا تھا۔ امان اللہ خان کا بہنوئی علی احمد جان اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اور قندھار میں امان اللہ خان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ امان اللہ خان نے علی احمد خان کو سپہ سالار نامزد کر کے بچہ سقہ کا مقابلہ شروع کر دیا تھا۔

جنوری کے ابتدائی ایام میں سردی زوروں پر تھی۔ آٹھ بجے کا وقت ہو گا کہ تقریباً سبھی افسر جو قلعہ میں موجود تھے۔ چوہدری صاحب کے کمرے میں آگ تاپ رہے تھے ان میں سے ایک بولا کہ انگریز کتنی ظالم قوم ہے کہ ایک چھوٹی سی ہمسایہ حکومت مسلمان کو ختم کر کے ہی دم لیا۔ دوسرا جس کے پاس تازہ زمیندار اخبار تھا بولا کہ پھر کیا ہوا امان اللہ خان نے انگریزوں کو جل دیا ہے یعنی دھوکے میں رکھا ہے اور اب اس نے بچہ سقہ سے ملک واپس لینے کے لیے بچہ سقہ کی فوجوں پر حملہ کر دیا ہے اور وہ اب اپنا ملک واپس لے کر انگریزوں کا مذاق اڑانے لگا ہے۔ زمیندار کا تازہ اخبار جو اس کے پاس تھا نکال کر اداریہ پڑھنے لگا۔ ان دنوں مولانا ظفر علی خان جو ایڈیٹر گو تھے خود اداریہ لکھتے تھے۔ کیونکہ مولانا غلام رسول مہر صاحب اور عبدالمجید سالک صاحب نے زمیندار سے الگ ہو کر اپنا اخبار انقلاب جاری کر لیا تھا۔ زمیندار میں مزید سٹاف نہیں رکھا

گیا تھا۔ اس نوٹ میں مولانا کا سحرِ نگارش جوبن پر تھا۔ وہ اسلام کے شیدائی اور افغانستان اور امان اللہ خان کے حامی اور خیر خواہ تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ افغانستان پائندہ رہے اور امان اللہ خان سلامت اور برسرِ اقتدار رہے۔ انہوں نے اپنی تمنا کو الفاظ کا جامہ پہنا کر اس طرح بیان کیا تھا گویا کہ امان اللہ خان نے اپنا ملک بچہ سقہ سے واپس لے لیا ہے اور انگریزوں پر خندہ زن ہے۔

خطرناک حرکت

اداریہ پڑھ چکنے کے بعد قاری اور سامعین سب مسحور ہو کر مولانا کے بیان کی تائید کر رہے تھے۔ اس وقت مولانا کے مضمون کو اور ان کی تمنا کو میں سراہتا تو تھا لیکن حالات کو ان کی تمنا کے بالکل برعکس پاتا تھا۔ جب میں نے مولانا کے جادو نگار قلم کے کرشمے کو اس رنگ میں دیکھا کہ فرنگی دشمن کا سپیشل سٹاف بھی مسحور ہو کر تائید میں رطب اللسان ہے تو بے اختیار میرا ایک بلند قہقہہ گونجا۔ قہقہہ کے فوراً بعد مجھے ہوش آ چکا تھا کہ میں کہاں ہوں اور مجھ سے یہ حرکت کتنی خطرناک سرزد ہوئی ہے۔ اس کا ردِ عمل فوراً اس شکل میں نمودار ہوا کہ سب افسر میری طرف سوالیہ نظروں سے متوجہ تھے۔ میں پہلے صفحات میں لکھ آیا ہوں کہ چوہدری صاحب جو میری تفتیش پر مامور تھے مجھ سے کافی متاثر تھے اور ان کے تاثر اور رویے کا ردِ عمل باقی عملے پر بھی اچھے تاثر کی صورت میں نمایاں تھے۔ وہ سب میری طرف متوجہ تھے۔ اور کہنے لگے کہ آپ کیوں ہنسے ہیں میں اپنی غلطی کو محسوس کر کے ابھی کچھ سوچ بچار میں مصروف تھا بے تکے انداز میں بولا مجھے کچھ خیال نہیں ہے کہ میں ہنسا ہوں۔ وہ بولے آپ ہم سب کو بناتے ہیں۔ کیا ہم یوں ہی پوچھ رہے ہیں۔ دریں اثنا میں سنبھل چکا تھا۔ میں نے سوالیہ کہا۔ کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ وہ بولے کہ تمہاری ہنسی کا سبب پوچھنا چاہتے ہیں۔

افغانستان کی واحد امید

میں نے کہا میں ایک نقش دیکھ رہا تھا۔ یہاں سے دور کچھ واقعات پیش آ رہے ہیں اور یہاں پر ایک شخص جو اصل حالات سے بے خبر ہے مگر اس کی اپنی تمنا ان حالات کے برعکس ہے ایک گرم کمرے میں کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس سردی میں کمرہ منقلی سے گرم ہے۔ اس کا حقہ بھی تازہ بھرا ہوا ہے۔ ایک طرف چائے کا کپ میز پر دھرا ہے اور وہ کبھی حقے کا کش لگاتے ہیں اور کبھی چائے کا گھونٹ نوش فرماتے ہیں اور جب سرور میں آتے ہیں تو اپنے جادو رنگار قلم سے امان اللہ خان کو اس کا تخت واپس سونپتے ہیں۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ برطانیہ کا سپیشل سٹاف اس کے قلمی جادو کا شکار ہو جاتا ہے اور مسحور ہو کر ایک انہونی بات کی تائید کرنے لگتا ہے تو بے اختیار میرے ہنسی نکل جاتی ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ تمہارے خیال میں اب کیا ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا ہنسی کا سبب میں بتا چکا ہوں اب دوسری بات کا ہنسی سے کوئی تعلق نہیں۔ انہوں نے دوبارہ کہا کہ آخر اب ہوگا کیا۔ میں نے کہا کیا اس سوال کا جواب ضروری ہے۔ ان کے اصرار پر میں نے سوچا کہ سزائے موت تو ہو گی ہی۔ اس کے جواب دینے سے کیا قیامت آ جائے گی۔ چنانچہ میں سنبھلا اور کہا کہ امان اللہ خان نے انگریزوں کی تمنا پوری کرنے کی غلطی کی ہے اور اس کی تلافی اب ناممکن ہے۔ مگر اگر اللہ تعالٰے کو افغانستان کو باقی رکھنا منظور ہے تو میری دانست میں اس کی ایک ہی صورت ہے کہ خدا تعالٰے نادر خان کے دل میں ڈال دے کہ وطن کو اس کی ضرورت ہے وہ واپس آ کر بچے سقے کو مغلوب کر سکتا ہے۔ افغانستان کے اندر بچے سقے کو مغلوب کر سکنے والی کوئی شخصیت موجود نہیں ہے۔ میرا جواب سن کر وہ اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔

نادر خان کی واپسی

اللہ تعالٰے کو جو کام جس طرح انجام دینا ہوتا ہے وہ اس کے اسباب پیدا فرما دیتا ہے

یہ مثال مجھ پر بالکل صادق آئی۔ "للو کرے کرلیاں رب سدھیاں پادے"۔ پنجابی کا محاورہ ہے کہ للو الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔ اور اللہ تعالےٰ انہیں درست فرما دیتا ہے۔ اگلے دن زمینداروں ہی یہ مبارک خبرے کر نمودار ہوا کہ نادرخان فرانس سے یہ بیان دے کر کہ میرے وطن کو میری ضرورت ہے اور وطن کی خدمت کے لیے وطن لوٹ رہا ہوں، جہاز میں سوار ہو گیا ہے۔ پس پھر اگلے دن میں قلعے میں ایک بے گناہ ملزم تھا وہ لوگ یہ کہہ رہے تھے اس نے کل کہا تھا کہ نادرخان کے دل میں اللہ تعالےٰ ڈال دے کہ اب وطن کو تیری ضرورت ہے اب واپس لوٹ چل اور فرانس میں بیٹھا ہوا نادرخان وہی بیان دے کر وطن لوٹنے کے لیے جہاز میں سوار ہو گیا۔

پولیس کی وکالت

اگلے دن خان بہادر عبدالعزیز سپرنٹنڈنٹ سپیشل پولیس نے اپنے عملے کو سرزنش کی کہ تم لوگوں نے اس ملزم کو نہ حوالات میں بند رکھا ہے اور نہ اس کو ہتھکڑی لگاتے ہو بلکہ اسے کھلا چھوڑ رکھا ہے۔ اگر یہ فرار ہو گیا تو کون ذمے دار ہو گا۔ یہ بات خود چوہدری شہاب دین صاحب نے مجھے بتائی اور بتایا کہ ہم نے اس کو جواب دیا کہ ہمیں اطمینان ہے کہ یہ شخص ہمیں دھوکا نہیں دے گا اور یہ کہ آپ افسر مجاز ہیں۔ اپنے حکم سے ایسا کر لیجیے۔ ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں۔ پولیس کا تشدد اور ملزموں کے ساتھ ناروا سلوک مشہور ہے اور ہے بھی درست، مگر کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے جیسا میرے ساتھ پیش آیا۔ اگرچہ ایسا دنیاوی خوف ہی کی وجہ سے ہو جیسا کہ چوہدری صاحب نے خود مجھے اپنا واقعہ سنایا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ چوہدری صاحب تشدد سے ڈرتے تھے کہ مبادا ناروا سختی سے خداوند کریم پھر کسی عذاب میں مبتلا نہ کر دے بہر حال اب پولیس کا عملہ مجھے بے گناہ سمجھنے لگا تھا۔ اگرچہ خان بہادر عبدالعزیز میرے لیے سزائے موت پر اڑے ہوئے تھے اور اپنے عملے کے رویے سے مطمئن نہ تھے۔ اب عملہ خود میری وکالت کر رہا تھا اور خان بہادر کو میری نسبت اپنا موقف

بدلنے پر مجبور کر رہا تھا۔

مدد کی خواہش

خدا تعالےٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے سزائے موت سے تو کسی قسم کی پریشانی نہ تھی البتہ صرف ایک خیال تھا کہ خدائے کریم میرے منہ سے کوئی ایسا کلمہ نہ نکلوائے جس کے نتیجے میں کوئی دوسرا دارو گیر کا شکار ہو جائے پھر ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ۔ خدائے وحدہ لاشریک نے میری یہ خواہش پوری کر دی۔ اب میری رہائی کی کوشش خود عملہ پولیس کر رہا تھا۔ رہائی سے ایک دن پہلے خواجہ تاج دین چوہدری شہاب دین سید احمد شاہ اور نیاز احمد صاحب ڈی ایس پی مجھے آخری بار ملے اور مجھے کہا کہ ہماری خواہش ہے کہ تم اس کیس میں ہماری مدد کرو۔ اگرچہ مجھے یہ معلوم تھا کہ یہ دھماکا چیف جسٹس سر شادی لال کے جانبدارانہ طرز عمل کا نتیجہ ہے۔ تاہم میں خاموش رہا۔ جماعت کا اسلحہ مرتضےٰ احمد خان میکش صاحب کے پاس تھا۔ اور اس واقعہ کا پورا پس منظر میرے ذہن میں تھا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ ایک رات عشاء کے وقت بولی صاحب گردوارہ کے اکالیوں نے محلہ کابلی مل حویلی میں عشاء کے وقت بے خبری میں نمازیوں پر حملہ کر کے چند مسلمانوں کو شہید کر دیا تھا۔ اس کے جواب میں پہلوان کالا جو کر اور اس کے چند ساتھیوں نے چند ہندو اور سکھ ہلاک کر دیے تھے۔ سر شادی لال چیف جسٹس پنجاب نے انتہا درجہ کی جانبداری کا ثبوت دیتے ہوئے اکالیوں کو رہا اور مسلمانوں کو عبور دریائے شور کی سزائیں دے ڈالیں۔ تو اس نازیبا انصاف کش حرکت کو مسلمان معاف نہ کر سکے اور اس دھماکے کی صورت میں انہوں نے انتقام کی آگ بجھائی۔ مگر میرے خیال میں مسلمانوں نے غلط مقام کا انتخاب کیا تھا۔ اگر وہ سر شادی لال کا دفتر یا اس کی کوٹھی یا خود بولی صاحب گردوارہ کا انتخاب کرتے تو اس سے بہتر ہوتا۔

الزام سے بریت

جس نے جان بوجھ کر پولیس افسروں کی اس خواہش کو کہ میں ان کی مدد کروں۔ ایک دوسرا رنگ دے دیا۔ گویا کہ وہ مجھے سی آئی ڈی میں کام کرنے کی پیش کش کر رہے ہیں۔ میں نے ان کو ٹالنے کے لیے کہا کہ آپ مجھ سے کیا کام لے سکیں گے کسی ملزم کے خلاف مجھ سے یہ کہلوا لیں گے کہ یہ فلاں وقت میرے پاس آیا تھا اور اس نے مجھ سے فلاں فلاں اسلحہ لیا تھا۔ تو یہ بھی کوئی کام ہے؟ اگر آپ مجھ سے کام لینا چاہتے ہیں تو مجھے باہر کا کچھ کام دیجیے۔ آپ کو معلوم ہو چکا ہو گا کہ بیرونی ممالک کے متعلق میرا مطالعہ کتنا وسیع ہے ڈپٹی صاحب میرا جواب سن کر بولے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم تمہیں خود باہر بھیج دیں۔ اور تم وہاں جا کر ہم پر یعنی فرنگی فوجوں پر فائرنگ کے ارمان پورے کرو اور آوازیں دیا کرو کہ عبدالکریم کی گولی آ رہی ہے۔ اس بات سے ڈپٹی صاحب کا اشارہ یہ تھا کہ جب ہمارے مجاہد کیمپ پر فائرنگ کرتے تو آواز دیا کرتے کہ فلاں کی گولی آ رہی ہے اور ساتھ ہی فائر کر دیتے۔ وہ کیمپ کے اتنے قریب ہوتے کہ کیمپ میں ان کی آواز سنائی دے سکتی۔ میں نے کہا ہاں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے معاملات تو اعتماد ہی پر چل سکتے ہیں۔ جس شخص پر آپ کو اتنا اعتماد ہے کہ یہ ایسا دغا کر سکتا ہے اس سے آپ کیا کام لے سکتے ہیں۔ یہی میری آخری بات چیت تھی۔ اس سے اگلے دن مجھے اس الزام سے بری کر دیا گیا کہ دسہرے کے موقع پر دھماکے کا ذمہ دار میں ہوں۔ بری ہونے پر مجھے چھٹی دے دی گئی۔ تقریباً پندرہ روز قلعے میں رہ کر میں نے اپنی جیب سے خود ہی خورد و نوش کیا اور اپنے ہی خرچ پر واپس امرتسر آ گیا۔

حالات پر تبصرہ

شاہی قلعہ میں جانے سے پہلے افغانستان میں بچہ سقہ کی بغاوت کا چرچا اخبارات میں اکثر رہتا تھا۔ شام کے بعد چند دوست جو مجھے جانتے تھے میری دکان پر اکٹھے

ہوتے تو اخبارات پر تبصرہ ہوتا تھا۔ میں نے چمرکنڈ میں مجاہد اخبار سے تعلق کی وجہ سے افغانستان کی اندرونی سیاست اور خلفشار کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا اور وہ چند دوست اسی بنا پر میرے پاس جمع ہوتے تھے۔ میرا تبصرہ اکثر درست ثابت ہوتا۔ بغاوت سے پہلے غازی امان اللہ خان یورپ کے دورے پر جا رہے تھے تو انہوں نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ دورے سے واپس آ کر ملاؤں کو سمجھوں گا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ فرنگی نے امان اللہ خان کے گرد بدخواہوں کا جو حصار قائم کر رکھا ہے اس نے امان اللہ خان کی نظر سے ملائی طاقت کا اصل درجہ اوجھل کر دیا ہے۔ اور یہ کہ امان اللہ خان کی یہ تقریر نہایت دور رس اور نہایت برے نتائج پیدا کرے گی۔ میں نے اپنے دوستوں سے کہہ دیا کہ امان اللہ خان نے یہ تقریر کر کے اپنے مستقبل کو سخت دھچکا لگایا ہے اور انگریزوں نے چونکہ یہ تقریر اپنے کارندوں کی کارستانی سے امان اللہ کے منہ سے اگلوائی تھی اس لیے اس کا خوب پراپیگنڈا کیا۔ ملکہ ثریا اس سفر یورپ میں امان اللہ خان کے ساتھ تھی اس کی تصویریں مختلف پوزوں اور حاشیے چڑھا کر تشہیر کی۔ ادھر ملاؤں میں سے خصوصاً ملا شور بازار کو جو افغانستان کا شاہی اور درباری پیر ہونے کی وجہ سے تمام ملاؤں سے ممتاز تھا خرید لیا۔ ملا صاحب نے بچہ سقہ کو ایک ہمدردِ خلائق اور بے دین بادشاہ سے نجات دہندہ کی شکل میں اجاگر کیا اور نتیجۃً بغاوت کی آگ بھڑکائی۔ باغی عنصر کی اسلحہ اور روپیہ سے بھرپور امداد کی۔

امان اللہ کی واپسی

امان اللہ خان جب یورپ سے واپس آئے تو پانی سر سے گذر چکا تھا۔ انہیں بغاوت کے اصل مرکز بچہ سقہ سے اتنا خوف نہیں تھا جتنا سمت مشرقی کے قبائل کی بغاوت کا خوف تھا۔ حالانکہ یہ قبائل ابھی باغی نہیں ہوئے تھے۔ افغانستان کا سچا ہمدرد اور امان اللہ خان کا بانہ وٹے شمشیر زن نادر خان انگریزوں کی بے ایمانی کی نذر ہو کر فرانس میں بطور احتجاج بیٹھا ہوا تھا۔ امان اللہ خان نے اپنے بہنوئی غازی علی احمد جان کو

ایک لشکر دے کر جلال آباد سمت مشرقی بھیج دیا۔ وہ مرکز کے احکامات کے انتظار میں سمت مشرقی بیٹھا رہا۔ حالانکہ مرکز میں اس کی زیادہ ضرورت تھی۔ حتیٰ کہ امان اللہ خان خونریزی سے ملک کو بچانے کے لیے اپنے بڑے بھائی عنایت اللہ خان کے حق میں دست برداری دے کر خود قندھار چلا گیا۔

علی احمد جان کی تقریر

انگریز افغانستان کے تخت پر بچہ سقہ جیسے کندہ ناتراش جاہل کو پسند نہ رکھتے تھے جو ملاؤں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی حیثیت رکھتا ہو۔ ملا جب چاہیں وہ جہاد کی لہر لگا دے وہ تخت پر کسی ایسے شخص کو دیکھنا چاہتے تھے جس سے وہ مذاکرات کر سکیں۔ امان اللہ خان کی دست برداری کے بعد وہ علی احمد جان سے سودا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ علی احمد جان نے مرکز پر قابض ہونے کے لیے کابل کی طرف کوچ کیا۔ بچہ سقہ مرکز پر قابض ضرور تھا۔ لیکن علی احمد جان (جس کی حمایت اب انگریز کر رہے تھے) کے مقابلے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ وہ بچہ سقہ کی کمزور فوج کو دھکیلتا ہوا باری کاب اور خاک جیسی گھاٹیوں کو عبور کر کے بت خاک جو کابل سے تھوڑے فاصلے پر ہے جا پہنچا۔ یہاں پہنچ کر علی احمد جان یہ بھول گیا کہ جو طاقت اسے یہاں تک لائی ہے اس کے عزائم کیا ہیں اور اس کی اپنی حیثیت کیا ہے۔ اس نے غلطی کی اور کابل کے ہمدردوں کی حمایت کے خیال سے کہہ دیا کریں جو کچھ کر رہا ہوں امان اللہ خان کے لیے ہے۔

علی احمد جان کا فرار

میں نے جب یہ خبر اخبار میں پڑھی تو میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا کہ بہت برا کیا اب خیر نہیں۔ علی احمد جان کو اس تقریر کے آدھ گھنٹہ بعد اپنی سنگین غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس نے ایک فقیر کا لبادہ اوڑھا اور بت خاک سے فرار ہو گیا۔ عام راستوں کو چھوڑ کر پہاڑی اور ناہموار راستوں سے ہوتا ہوا چمرکنڈ جا پہنچا۔ مولانا بشیر نے جو افغانستان کے انتہائی

خواہ تھے اور دوستی کے حق کو نبھانے کی ہمیشہ کوشش کرتے تھے علی احمد جان کی ہر طرح خاطر مدارت کی ان کے لیے کپڑے بنوائے اور ان کو چند روز سستانے کی غرض سے روکا اور زادِ راہ کے لیے رقم پیش کی۔ وہ امان اللہ کے پاس قندھار پہنچ گئے۔ اور امان اللہ خان نے انہیں سپہ سالار بنا کر بچہ سقہ کے ساتھ مقابلے کا آغاز کر دیا۔

احسان کا بدلہ

اس بغاوت کا اصل سرغنہ ملا مے شور بازار تھا جو دستوراً شاہی خاندان کا پیر مانا جاتا تھا وہ امان اللہ خان کو سرے سے مسلمان ہی نہیں مانتا تھا۔ شاہی پیر ہونے کی وجہ سے وہ تمام رعایا اور امان اللہ خان کی قوم کا بھی پیر تھا۔ ادھر علی احمد جان کچھ افواج لے کر نکلا اور دوسری طرف ملا شور بازار قندھار پہنچا اور لوگوں کو امان اللہ خان کی حمایت سے روکا۔ ملاؤں کا اثر و نفوذ عوام میں اس قدر تھا کہ لوگوں نے ملا کی بات پر آمنا کہا اور علی احمد جان بچہ سقہ کی فوجوں کی حراست میں کابل لایا گیا۔ بچہ سقہ نے نہایت بے دردی سے پہلے تو دو من وزن کے طوق و سلاسل اس کے جسم پر لادے اور پا پیادہ سارے شہر میں پھرایا اس کے بعد توپ سے اڑا دیا۔ سچ ہے کہ کمینہ کمینہ ہی رہتا ہے۔ اگرچہ وہ تخت پر ہی کیوں نہ براجمان ہو۔ یہی علی احمد جان جب کابل کے گورنر تھے تو بچہ سقہ ایک ڈاکو کی حیثیت سے علی احمد جان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ علی احمد جان اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوا اور کہا کہ ایسا تنومند خوبصورت جوان کبھی قوم کے کام آسکتا ہے۔ اسے رہا کرنے کا حکم دیا۔ مگر جب کمینہ اس مقام پر پہنچا جہاں وہ قوم کے کسی کام آسکتا تھا تو اس نے جان بخشی کرنے والے محسن کو کتنی ایذائیں دیں اور محسن کے احسان کا بدلہ چکا دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

امن کی بحالی

امان اللہ خان ابھی قندھار ہی میں تھے کہ نادر خان بمبئی کی بندرگاہ پر اترے اور ٹرین میں سوار ہو کر عازم پشاور ہوئے۔ دہلی سے مولانا محمد علی جوہر ان کے ساتھ لاہور تک گئے

راستے میں بچہ سقہ سے وطن کو آزاد کرانے کے متعلق تبادلہ خیال ہوتا رہا اور آئندہ کے لیے ہندوستان کے مسلمانوں اور افغان باشندوں کے تعلقات پر بھی بحث ہوا کی۔ لاہور سے حضرت مولانا ظفر علی خان پشاور تک جانے کے لیے ہمراہ ہو گئے۔ نادر خان مولانا ظفر علی خان کے اس موقف سے متفق نہ ہو سکے کہ نادر خان پہلے امان اللہ خان سے مل کر ان سے صفائی کر کے گذشتہ را صلوٰۃ و آئندہ را احتیاط کے نارہ ہونے پر عمل کرنے کے لیے کہیں۔ نادر خان کا خیال تھا کہ بچہ سقہ کو پاؤں مضبوط کرنے کے لیے مہلت دینا درست نہ تھا۔ امان اللہ خان مایوس ہو کر قندھار سے اٹلی چلے گئے اور نادر خان وطن کی خلاصی میں مشغول ہو گئے۔ نادر خان حالات کو بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ انہوں نے منگل نرازی اور وزیری قبائل کا لشکر تیار کیا اور بچہ سقہ کے مقابلے کے لیے آگے بڑھے۔ انگریز جو کہ افغانستان کے تخت پر بچہ سقہ کو پسند نہ کرتے تھے انہوں نے بچہ سقہ کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا اور نادر خان جلد ہی بچہ سقہ کو کیفر کردار تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے بچہ سقہ کے حمایتی وزراء اور نوکر شاہی کو بھی کیفر کردار تک پہنچایا اور ملا شور بازار کو سفارت کے عہدہ پر فائض کر کے مصر بھجوا دیا۔ افغانستان پھر ایک بار امن و امان کی نعمت سے مالا مال ہو گیا۔ امان اللہ خان کئی سال اٹلی میں جلا وطن رہ کر راہی ملک بقا ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اللہ تعالےٰ ہی حقیقی مالک الملک ہے۔ جس کو چاہے ملک دے اور جس سے چاہے ملک چھین لے۔ خیر اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تمت بالخیر

غازی عبدالکریم چمرکنڈی